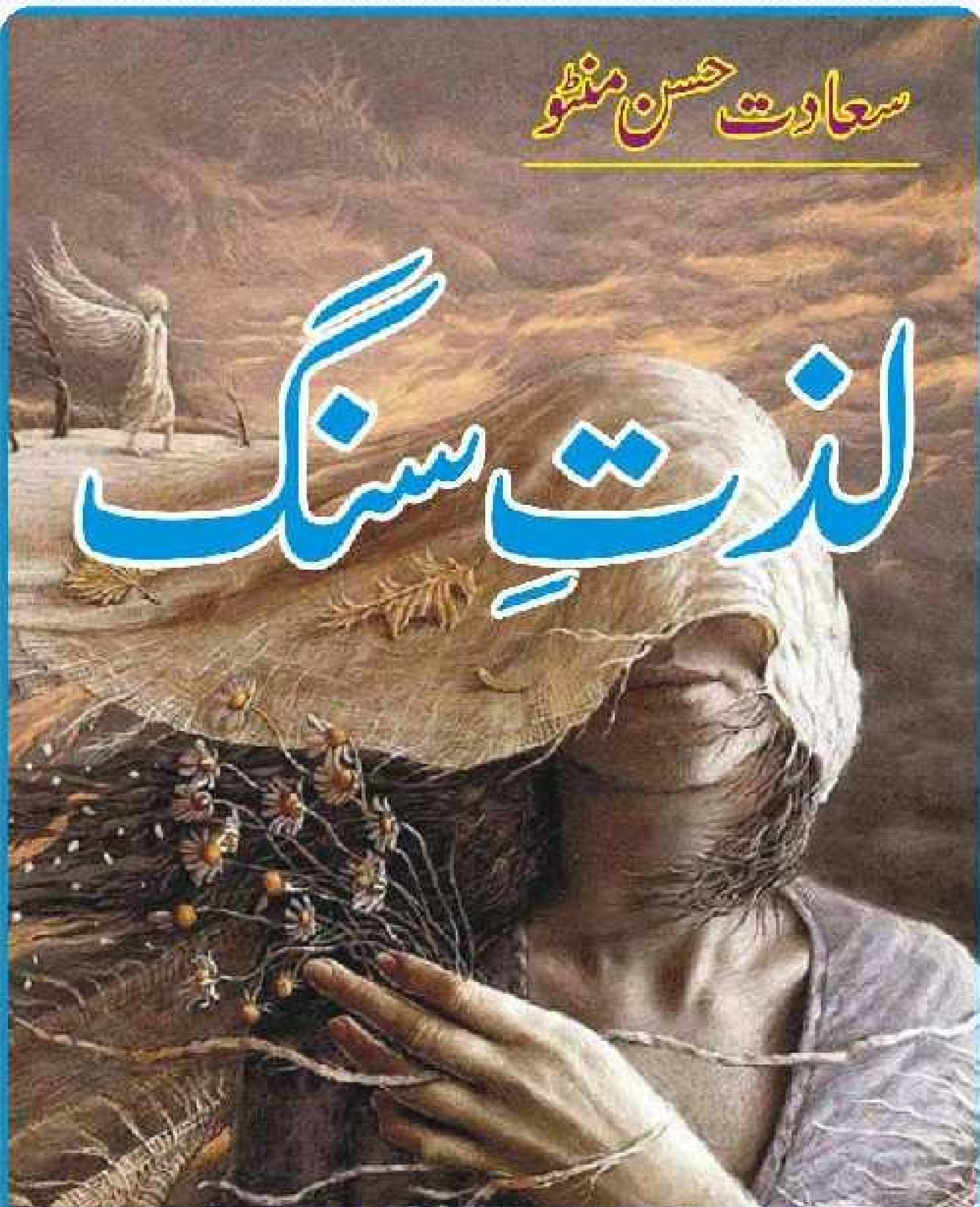

سعادت حسن منٹو
لذتِ سنگ

لذت سنگ

افسانے

سعادت حسن منٹو

لذت سنگ

دیباچہ

''لاہور کے ایک رسوائے عالم رسالے میں جو فحاشی و بیہودگی کی اشاعت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے' ایک افسانہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''بو'' اور اس کے مصنف ہیں مسٹر سعادت حسن منٹو۔ اس افسانے میں فوجی عیسائی لڑکیوں کا کیریکٹر اس درجہ گندا بتایا گیا ہے کہ کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانہ نگار نے اظہار مطلب کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے اور جو الفاظ منتخب کیے ہیں ان کے لیے تہذیب' شرافت کے دامن میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن حکومت اب تک خاموش ہے حالانکہ یہی حکومت ہے جو ''لذت النساء'' اور ''کوک شاستر'' ایسی فنی (یہ استفہامیہ میرا ہے) کتابوں کو بھی قابل مواخذہ سمجھتی ہے' لیکن ایسے افسانوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتی' جو ادب جدید کے نام سے سفلی جذبات میں ہلچل ڈالنے کا موجب ہیں اور فحاشت نگار ادیبوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ وہ قانون کی گرفت سے بے نیاز ہو کر گندگی بکھیرتے رہتے ہیں۔''

(ہفتہ وار ''خیام'' لاہور)

''پریس برانچ کے انچارج چودھری محمد حسین بہت نیک خیال کے بزرگ ہیں۔ اس قسم کے افسانے پڑھ کر ان کی روح یقیناً کانپ اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ میں قانون ہے اور وہ اسے نہایت سختی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ جس طرح قابل اعتراض مذہبی مضامین لکھنے والوں کے خلاف گورنمنٹ کی مشینری حرکت میں آئی' اسی طرح ان گندے افسانوں کو لکھنے والے سعادت حسن منٹو وغیرہ بیچنے والے پبلشر جو رسالے کی فروخت سے ہزاروں روپیہ کماتے ہیں اور چھاپنے والے پریس کے مالک کو فوراً گرفتار کر لیتے اور ان میں سے ہر ایک کو تین تین سال کے لیے جیلوں میں بند کرا دیتے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی عدالت ان افسانوں کو قانون کی زد سے نہیں بچنے دے گی۔ یہ صاف طور سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں بداخلاقی پھیلاتے ہیں اور عوام کا

مذاق بگاڑتے ہیں۔"

(روزنامہ "پربھات" لاہور)

"ادب لطیف" اس نام کا ایک رسالہ لاہور سے شائع ہوتا ہے' یہ کہنے کو تو ایک ادبی ماہنامہ ہے لیکن اگر اسے ادب کشف کہیے تو بجا ہے۔اس کا سالانہ نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جس میں ایک لچر اور فحش افسانہ از قلم فحش نگار سعادت حسن منٹو شائع ہوا ہے جس کے خلاف ہم نہایت پرزور احتجاج کرتے ہیں۔فقط اس کے کوک شاسترانہ خیالات کی وجہ سے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ گورنمنٹ عالیہ کی ویمنز اگزالری کور (WAC) کی مساعی رباب جنگ کی راہ میں روڑا اٹکانے والا اور اس کی بدنامی کا موجب ہے حتیٰ کہ اس محکمہ کو بیہودہ شخص قحبہ خانہ کا نام دیتا ہے۔ہم حیران ہیں کہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر گورنمنٹ کی مشینری فوراً حرکت میں آجاتی ہے' لیکن اس خلاف تہذیب مضمون پر اس کی اب تک نظر نہیں پڑی۔کیا سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ اس بداخلاق اور بے ادب "ادیب" اور رسالہ مذکور کے خلاف جلد کوئی کارروائی نہ کریں گے' دیکھا چاہیے!

("اخوت" لاہور)

"ایک مقامی ماہنامہ نے سعادت حسن منٹو کا ایک فحش افسانہ "بو" شائع کیا تھا۔"خیام" میں اس اخلاق سوز حرکت کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی جو حکومت پنجاب کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی' چنانچہ معلوم ہوا کہ جس پرچے میں "بو" شائع ہوا تھا' وہ ضبط کرلیا گیا ہے۔یہ ضبطی ۳۸ / ۲۹۲ دفعہ کے ماتحت عمل میں آئی۔ہم اس فیصلے پر حکومت پنجاب کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی فحاشی کو مستقل طور پر روکنے کے لیے کوئی موثر قدم اٹھائے گی۔"

(ہفتہ وار "خیام" ۱۸ اپریل ۱۹۴۴ء)

۳۱ ملک بلڈنگ' میو روڈ لاہور

بھائی جان' سلام شوق!

برادرم آغا خلش صاحب کا گرامی نامہ پرسوں ملا تھا۔آپ کی علالت کا علم ہوا' اللہ کرے آپ اب تک اچھے ہوں جب آپ کو اپنی صحت کا اندازہ ہے تو اتنا زیادہ کام کیوں کرتے ہیں کہ دونوں صاحب فراش رہتے ہیں۔مجھے لوٹتی ڈاک میں اپنی صحت کی حالت سے مطلع کیجئے اور اللہ اتنی محنت نہ کیجئے کہ آپ انجکشن کے کانٹوں میں گھرے رہ جائیں۔ابھی برسوں تک آپ کی ضرورت ہے۔لیجئے'

خیام' عالمگیر' آئینہ (بمبئی) اور دیگر مہربانوں کے دم سے "ادب لطیف" کا سالنامہ زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند اور ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز ۲۹ مارچ کو شام کو ضبط ہو گیا۔ پولیس نے چھاپہ مارا۔ سالنامے کے باقیماندہ نمبر لے گئی ابھی پروپرائٹروں اور ایڈیٹروں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی' لیکن افواہ ہے کہ ہم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ یہ ضبط آپ کے مضمون اور افسانے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔

(احمد ندیم قاسمی' ایڈیٹر "ادب لطیف")



مضمون جس کا ذکر محولہ صدر خط میں ہے' ایک تقریر ہے جو میں نے جوگیشوری کالج بمبئی میں طالب علموں کو پڑھ کر سنائی تھی۔ اس سے پہلے چند اصحاب ادب جدید کے خلاف اس کالج میں تقریریں کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کالج کی مجلس ادب کی دعوت قبول کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ تقریر بعد میں ادب جدید کے عنوان سے "ادب لطیف" کے زیر عتاب سالنامہ ۱۹۴۴ء میں میرے افسانے "بو" کے ساتھ شائع ہوئی۔ میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

"میرے مضمون کا عنوان "ادب جدید" ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ اسی چیز کے متعلق باتیں کرتے ہیں جن کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں گاندھی جی نے آغا خان کے محل میں مرن برت رکھا۔ جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں تو ایک نارنگی پیدا کر دی۔ یہ نارنگی بھی کچھ دنوں کے بعد ناقابل فہم ہو گئی۔ بعض آدمیوں نے کہا کہ نارنگی نہیں تھی' موسمی تھی۔ بعض نے کہا نہیں موسمی' نارنگی ہرگز نہیں تھی' مالٹا تھا۔ بات بڑھتی گئی۔ چنانچہ اس پھل کی ساری ذاتیں گنوا دی گئیں۔ نارنگی' سنگترہ' موسمبی' مالٹا' چکوترہ' سویٹ لائم' کھٹا لیموں' میٹھا لیموں وغیرہ وغیرہ۔ پھر ڈاکٹروں نے ان میں سے ہر ایک کی وٹامنز گنوائیں۔ غذائیت کو کیلوریز میں تقسیم کیا گیا۔ ایک برس میں پچھتر برس کے بڈھے کو کتنی کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر بحث کی گئی اور صاحب گاندھی جی کی یہ نارنگی یا موسمبی جو کچھ بھی تھی' سعادت حسن منٹو بن گئی۔ یہ میرا نام ہے لیکن بعض لوگ ادب جدید المعروف نئے ادب یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنہیں صنف کرخت پسند نہیں وہ اسے عصمت چغتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔

جس طرح میں' یعنی سعادت حسن منٹو اپنے آپ کو نہیں سمجھتا اسی طرح ادب جدید المعروف نیا ادب یعنی ترقی پسند لٹریچر بھی میری فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ ان لوگوں کی سمجھ سے بھی سوچا ہے جو اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے

طور پر چند مضمونوں میں اس ادب کو جس کے کئی نام ہیں اور زیادہ نام دینے کے لیے فحش نگاری اور مزدور پرستی سے منسوب کیا گیا ہے۔ میں چیزوں کے نام رکھنے کو برا نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا نام اگر نہ ہوتا تو وہ گالیاں کیسے دی جاتیں' جواب تک میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے نقادوں سے وصول کر چکا ہوں۔ نام ہو تو گالیاں اور شاباشیاں دینے اور لینے میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک ہی چیز کے بہت سے نام ہوں تو الجھاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔

سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے' گدھا ہے۔ مکان ہے' میز ہے' یا کوئی اور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں' یعنی وہ ترقی نہیں چاہتے۔ میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مند رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں۔ آج آپ طالب علم ہیں' ترقی کرتے کرتے آپ بھی اپنے آئیڈیل تک پہنچ جائیں۔

ہر آدمی ترقی پسند ہے۔ وہ لوگ جنہیں تخریبی یا رجعت پسند کہا جاتا ہے' خود کو ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں۔ اور پھر زمانے میں قریب قریب ہر آدمی گزری ہوئی نسل کے مقابلے میں اپنے کو زیادہ ذہین' طبع اور ترقی یافتہ انسان ہی سمجھتا ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ شرر کے ناول اور راشد الخیری کے قصے آج کل کے اکثر مصنفین کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جایئے۔ آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی کتابیں' ایم اسلم' تیرتھ رام فیروز پوری' سید امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں' اس لیے کہ کرشن چندر اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے بیان کئے۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک کی سیاسی اور مجلسی حالت بالکل مختلف تھی۔ اسی طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پچاس ساٹھ برس اور پہلے کیسی ہوگی' اور اگر مغلئی حکومت کا دور دورہ ہوتا تو بہت ممکن ہے میرے گھر میں ایک حرم سرائے ہوتی۔ حرم سرائے نہ ہوتی تو کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی' اور دو تین طوائفیں میری ملازمت میں ہوتیں' مجھے بٹیریں لڑانے کا شوق تھا۔ یہ مضمون پڑھنے کے بجائے میں پرنسپل صاحب بالقابہ کی شان میں ایک قصیدہ سناتا جو خوش ہو کر یا تو میرا منہ موتیوں سے بھر دیتے یا جوگیشوری کالج مجھے بخش دیتے تاکہ میں اپنا طویلہ بنا سکوں۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں' حالت بہت مختلف ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل اسٹیشن جانا

پڑے گا اور فلمستان میں اپنے آقاؤں کو جواب دینا پڑے گا کہ میں اتنی دیر ڈاکٹر کے پاس کیا کرتا رہا۔ ان سے جھوٹ بول کر آیا ہوں کہ ڈاکٹر سے ٹیکہ لگوانے جا رہا ہوں۔ ہاں' تو میں عرض کر رہا تھا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور یہ اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی' لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کریں۔ آج کا شاعر اپنی جواں مرگی پر زوردار نوحہ لکھتا ہے۔ اس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا' آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ اپنے ماحول' اپنے نظام' اپنی معاشرت' اپنے ادب' حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔ اس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسند کہتا ہے' کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوط آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے۔ اور کیوں نہ رہے' مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے۔ جب کبوتر' کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ عورتیں' کبوتروں سے کہیں زیادہ دلچسپ خوبصورت اور فکر انگیز ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں' آج سے کچھ عرصہ پہلے شاعری میں عورت کو ایک خوبصورت لڑکا بنا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے شاعروں نے اس میں کوئی مصلحت دیکھی ہوگی۔ مگر آج کے شاعر اس مصلحت کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کے چہرے پر سبزے یا خط کے آغاز کو بہت ہی مکروہ اور خلاف فطرت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کو اس کی اصلی شکل ہی میں دیکھیں۔ خدا لگتی کہیے' کیا آپ اپنی محبوبہ کے گالوں پر داڑھی پسند کریں گے؟

میں عرض کر رہا ہوں کہ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ آج اس نے جو کروٹ بدلی ہے اس کے خلاف اخباروں میں مضمون لکھنا یا جلسوں میں زہر اگلنا بالکل بیکار ہے۔ وہ لوگ جو ادب جدید کا' ترقی پسند ادب کا' فحش ادب کا یا جو کچھ بھی یہ ہے' خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کر دیا جائے' جو اس ادب کے محرک ہیں۔ محمود آباد کے راجہ صاحب کا حیدرآباد کے شاعر ماہر القادری صاحب کا یا بمبئی کے دوا فروش حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب کا اس لٹریچر کے خلاف ریزولیوشن پاس کرنا بالکل بیکار ہے۔ جب تک عورتوں اور مردوں کے جذبات کے درمیان ایک موٹی دیوار حائل رہے گی' عصمت چغتائی اس کے چونے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی' جب تک کشمیر کے حسین دیہاتوں میں شہروں کی گندگی پھیلی رہے گی' غریب کرشن چندر ہولے ہولے روتا رہے گا۔ جب تک انسانوں میں اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو میں کمزوریاں موجود ہیں' وہ

خوردبین سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالتا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا۔ راجہ صاحب محمود آباد اور ان کے ہم خیال کہتے ہیں۔ یہ سراسر بیہودگی ہے۔ تم جو کچھ لکھتے ہو' خرافات ہے۔ میں کہتا ہوں' بالکل درست ہے۔ اس لیے کہ میں بیہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔ راجہ صاحب محمود آباد ایک کانفرنس کے صدر بن جائیں یا حکیم حیدر بیگ صاحب کھانسی دور کرنے کا مجرب شربت ایجاد کریں' مجھے ان کی صدارت اور ان کے شربت سے کوئی دلچسپی نہیں' البتہ جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں' صرف اس غرض سے کہ لوگ دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لیے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی' لیکن جب میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑ کر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما دیکھنے چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر اہمیت نہیں دیتا' مگر وہ لڑکا میری توجہ کو اپنی طرف ضرور کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں۔ لیکن در حقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ۔ اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوں گی' اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناؤں گا۔ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے' میرے افسانوں کی ہیروئین نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئین چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آرہا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں' میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت' اس کی بیماریاں' اس کا چڑچڑا پن' اس کی گالیاں یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں' ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔ میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا' اپنے متعلق کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے۔ کیوں ہے.......... بس ہے۔ سمجھ لیجئے کہ مجھ میں Perversion ہے اور اگر آپ عقلمند ہیں' چیزوں کے عواقب و عواطف اچھی طرح جانچ سکتے ہیں تو سمجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے۔ زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں' اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان

افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں' وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے' دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔ میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات وجذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب وتمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی...... میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا' اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں' میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا' سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور بھی نمایاں ہو جائے۔ یہ میرا خاص انداز' میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری' ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کچھ کہا جاتا ہے۔ لعنت ہو سعادت حسن منٹو پر' کم بخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تو گھر والے سب بیزار تھے۔ باہر کے لوگوں کو بھی میرے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔ ''بھئی کوئی نوکری تلاش کرو۔ کب تک بیکار پڑے افسانے لکھتے رہو گے۔'' آٹھ دس برس پہلے افسانہ نگاری بیکاری کا دوسرا نام تھا' آج اسے ادب جدید کہا جاتا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن نے کافی ترقی کر لی ہے۔ وہ وقت بھی آ جائے گا جب اس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا اور حکیم حیدر بیگ صاحب دہلوی کو اپنے شفا خانے سے اٹھ کر نئے لکھنے والوں کے روگ کی تشخیص نہیں کرنا پڑے گی۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے' ادب جدید پر ایک نئے زاویے سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ساری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹی ہے' ہر روز ہزاروں انسانوں کا خون مٹی میں مل رہا ہے۔۔۔۔۔۔ فنا بادۂ ہر جام بنی ہے۔۔۔۔۔۔ دوسری اجناس کی طرح انسانوں کے گوشت پوست کی دکانیں بھی کھلی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ نئے لکھنے والے کیوں خاموش ہیں؟۔۔۔۔۔۔ کیا ان کے قلم صرف جنسیات کی روشنائی میں ڈوبتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔ دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے۔۔۔۔۔۔ ہر لحظہ' ہر گھڑی ایک نئے طوفان کا پیغام لا رہی ہے مگر ان کے دل ودماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ دور ہی نہیں ہوتا۔

میں پھر دوسروں کی طرف سے جواب نہیں دوں گا۔۔۔۔۔۔ اپنے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا نقشہ واقعی بدل رہا ہے لیکن اگر میں نے اس کے متعلق کچھ لکھ دیا تو میرا حلیہ بھی بدل جائے گا۔ ڈرپوک آدمی ہوں' جیل سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ زندگی جو بسر کر رہا ہوں' جیل سے کم تکلیف دہ نہیں۔ اگر اس جیل کے اندر ایک اور جیل پیدا ہو جائے اور مجھے اس میں ٹھونس دیا جائے تو چٹکیوں میں دم گھٹ جائے۔ زندگی سے مجھے پیار ہے' حرکت کا دلدادہ ہوں' چلتے پھرتے' سینے میں گولی کھا سکتا ہوں لیکن جیل میں کھٹمل کی

موت نہیں مرنا چاہتا۔ یہاں اس پلیٹ فارم پر یہ مضمون سناتے سناتے آپ سب سے مار کھالوں گا اور اف تک نہیں کروں گا' لیکن ہندو مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوند روتی رہے گی۔ میں آرٹسٹ ہوں اور اوچھے زخم اور بھدے گھاؤ مجھے پسند نہیں۔ جنگ کے بارے میں کچھ لکھوں اور دل میں پستول دیکھنے اور اس کو چھونے کی حسرت دبائے کسی تنگ وتاریک کوٹھڑی میں مرجاؤں۔۔۔۔۔۔۔ ایسی موت سے تو یہی بہتر ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑ کر ڈیری فارم کھول لوں اور پانی ملا دودھ بیچنا شروع کر دوں۔ میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ گولے اور تارپیڈو ایک طرف رہے' میں نے تو آج تک ہوائی بندوق بھی نہیں چلائی۔ بچپن کی بات ہے' ہمارے پڑوس میں ایک تھانے دار رہتے تھے' ان کے پاس پستول تھا۔ پیٹی اتار کر جب وہ پلنگ پر رکھتے تو سب بچوں سے کہہ دیا جاتا' دیکھو اس کمرے میں مت جانا' وہاں پستول پڑا ہے۔ کبھی کبھی ہم ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں چلے جاتے۔ دور کھڑے رہ کر اس خطرناک آلے کی طرف دیکھتے تو دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پڑے پڑے وہ پستول دغ جائے گا۔ اب بتایئے' میں اور میرے دوست ٹینکوں کے بارے میں کیا لکھیں گے!

مجھے چست وردی پہننے کا شوق نہیں ہے۔ پیتل اور تانبے کے تمغوں اور کپڑے کے رنگین بلوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہوٹلوں میں ڈانس کر کے' کلبوں میں شراب پی کر اور ٹیکسیوں میں چونا کتھا لگی لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر میں دارالفرٹ کی مدد کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے کہیں زیادہ دلچسپ مشاغل مجھے میسر ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مشغلہ کیا برا ہے کہ میں ہر روز بمبئی سنٹرل سے گورے گاؤں اور گورے گاؤں سے بمبئی سنٹرل تک برقی ٹرین میں سینکڑوں وردی پوش فوجیوں کو دیکھتا ہوں جو فتح ونصرت کو اور زیادہ قریب لانے کے لیے شراب کے نشے میں مدہوش یا تو ٹانگیں پسارے سو رہے ہوتے ہیں یا نہایت ہی بدنما عورتوں سے میری موجودگی سے غافل نہایت ہی واہیات قسم کا رومانس لڑانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا' لیکن جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ یہ خود بخود چل پڑے گا تو میں اسے لہراتا ہوا باہر نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا۔۔۔۔۔۔۔ یا خود چھلنی ہو جاؤں گا۔ اس موت پر جب میرا کوئی نقاد یہ کہے گا کہ پاگل تھا تو میری روح ان لفظوں ہی کو سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھالے گی اور اپنے سینے پر آویزاں کر لے گی۔"



اس تقریر یا مضمون پر حکومت پنجاب نے زیر دفعہ ۳۰ ڈیفنس آف انڈیا رولز مقدمہ چلایا۔ الزام یہ ہے کہ اس میں حضور ملک

معظم کی ''فورسز'' کے متعلق ایسی غلط باتیں موجود ہیں جن سے ان کو ضعف پہنچ سکتا ہے۔ ''بو'' پر جو اس کتاب کا پہلا افسانہ ہے صرف فحاشی کا الزام ہے۔

مقدمہ جیسا کہ ظاہر ہے لاہور میں چودھری برکت علی ولد چودھری محمد نتھو ساکن لاہور' مالک ''ادب لطیف'' چودھری نذیر احمد ولد چودھری غلام حسین قوم الراعی ساکن لاہور (ایڈیٹر) پیرزادہ احمد ندیم قاسمی ساکن لاہور (ایڈیٹر) سعادت حسن منٹو ولد غلام حسن منٹو ساکن بمبئی کے خلاف مسٹر بنواری لال کی عدالت میں پیش ہوا۔

مجھے بمبئی سے بہت ضروری کام چھوڑ کر حاضر ہونا پڑا۔ لاہور پہنچا تو خیال تھا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے گا کیونکہ میرے وارنٹ جاری ہو چکے تھے مگر سب انسپکٹر صاحب نے جن سے اتفاقیہ مکتبہ اردو میں ملاقات ہوئی' مجھ سے کہا کہ میں صبح دوسرے ملزمین کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو جاؤں۔ گورنمنٹ کالج کے بالکل سامنے گرد و غبار میں اٹی ہوئی اینٹوں کی دو منزلہ عمارت ہے جسے ضلع کہتے ہیں' شاید جگت کے طور پر۔۔۔۔۔۔۔ اس عمارت کے ایک کمرے میں ہم سب ملزم پیش ہوئے۔ پہلے میری ضمانت ہوئی، اس کے بعد کارروائی شروع ہوئی۔ میں اس سے پہلے اس عدالت میں اپنے افسانے ''کالی شلوار'' کے مقدمے کے سلسلے میں پیش ہو چکا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب چنانچہ میری طرف دیکھتے ہی مسکرا دیئے۔ استغاثے کی گواہیاں ہوتی رہیں۔ میں خاموش سنتا رہا' اس لیے کہ سب کی سب لایعنی' بے ہودہ اور منطق و استدلال سے عاری تھیں۔ اسی روز میں نے اپنے وکیل مسٹر ہیرا لال سبیل کی معرفت عدالت سے درخواست کی کہ میری حاضری آئندہ پیشیوں میں معاف کر دی جائے۔ عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی۔

اتفاق سے ان دنوں میرے بڑے بھائی الحاج محمد حسن منٹو بار ایٹ لاء جزائر فجی سے لاہور آئے تھے۔ میں نے ان کو اپنا افسانہ ''بو'' اور مضمون ''ادب جدید'' پڑھنے کے لیے دیا اور پوچھا کہ انجام کیا ہوگا۔ دونوں چیزیں بغور پڑھنے کے بعد انہوں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ استغاثے کی گواہیاں سننے کے بعد ہی مجسٹریٹ مقدمہ خارج کر دے گا۔'' لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں بمبئی چلا آیا تھا۔ وہاں لاہور میں فرد جرم عائد ہو گیا اور دونوں چودھریوں اور احمد ندیم قاسمی کو صفائی کے گواہ پیش کرنے میں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ اسی دوران میں مسٹر بنواری لال تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ چودھری مہدی علی خان متعین ہوئے۔ چونکہ یہ مقدمے کی تفصیل سے بخوبی واقف نہیں تھے' اس لیے فیصلہ مرتب کرنے میں کافی دیر ہو گئی۔

۲ مئی ۱۹۴۵ء کو چودھری مہدی علی خان نے بالآخر فیصلہ سنا دیا۔ صرف اتنا کہا کہ سعادت حسن منٹو بری ہے' اس لیے کہ مسٹر بنواری لال اسے پہلے ہی بری کر چکے تھے۔ میں نے سوچا اگر ایسا ہی تھا تو مجھے بمبئی سے لاہور آنے کی زحمت کیوں دی گئی۔ احمد ندیم

قاسمی بھی بری کر دیے گئے لیکن دونوں چودھریوں کو ساٹھ روپے فی کس کے حساب سے جرمانہ ہوا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ایک ماہ قید بامشقت۔ مشقت کا نام سنتے ہی چودھریوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جرمانہ ادا کر دیا۔

اس کے بعد چودھری مہدی علی خان کے فیصلے کے خلاف مسٹر ایم آر بھاٹیہ ایڈیشنل جج کی عدالت میں اپیل کی گئی۔ فیصلہ ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو ہوا' جس کا ترجمہ یہ ہے۔

''زیر نظر مقدمہ دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند کے تحت ہے جس میں برکت علی اور نذیر احمد کو ساٹھ روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ماہ قید بامشقت کی سزا کے خلاف مجھ سے اپیل کی گئی ہے۔

ماتحت عدالت فاضلہ نے اپنے فیصلے میں یہ ریمارک کیا ہے کہ مضمون ''بو'' کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت ترین سزا کا مستحق ہے اور یہ کہ وہی صحیح آدمی تھا جسے قانونی گرفت میں لینا چاہیے تھا مگر پیش رو فاضل جج (مسٹر بنواری لال) نے اسے بری کر دیا۔

موجودہ ملزموں میں سے ایک پبلشر ہے اور دوسرا ایڈیٹر جس نے مضمون چھاپا۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی' مسٹر کے ایل کپور' پروفیسر ڈی اے وی کالج' راجندر سنگھ (بیدی) اور ڈاکٹر آئی ایل لطیف پروفیسر ایف سی کالج جو بطور گواہان صفائی پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون ''بو'' میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے' بلکہ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے ماڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثہ کے گواہ نمبر چار بشیر نے بھی دوران جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتا۔

میری نظر میں مضمون ایک عشقیہ کہانی ہے۔ ایک لڑکے اور لڑکی کی جس میں ایسی بات کا دلچسپ ذکر ہے جو عموماً ہر روز نوجوان آدمیوں میں نہیں ہوتی۔

ماتحت عدالت فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیریکٹر نابود ہو رہا ہے۔

ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں یاد کرائی ہیں جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالت فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ حسین چیز ایک

دائمی مسرت ہے۔ آرٹ جہاں کہیں بھی ملے' ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں' سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیشکش ہے چاہے اس کا موضوع غیر معقول ہی کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے' سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا مضمون نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔''



مجھے چونکہ ''شہادت'' کا رتبہ حاصل نہیں کرنا ہے' اس لیے میں ان تکلیفوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو مجھے لاہور آنے جانے میں اٹھانی پڑیں۔ ایک لعنت سر سے دور ہو گئی' یہی کافی تھی۔ مجھے ان اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا ہے جن میں ہفتوں بلکہ مہینوں حکومت اور رعایا کے اخلاقیات کے سبق دیئے جاتے رہے۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ پرچے ایسے لوگوں کی ملکیت ہیں جو عضو خاص کی لاغری اور کجی دور کرنے کے اشتہار خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر شائع کرتے ہیں۔ لیکن اپنے ایڈیٹروں کی ٹیڑھی بنگی ٹانگوں اور ان کی جھکی ہوئی کمروں کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ مجھے ان قلم سے مزدوری کرنے والوں سے دلی ہمدردی ہے۔ ان میں سے اکثر شریف آدمی ہیں جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن چونکہ پرچہ چھپنا ہی چاہیے اور اس میں شروع سے لے کر آخر تک کچھ لکھا بھی ہونا چاہیے' اس لیے یہ مجبور انسان' سیاست' سائنس اور ادب پر جو بھی ان کے نا تربیت یافتہ دماغوں میں آئے' کاغذ پر گھسیٹ دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ صحافت جیسے معزز پیشے پر ایسے لوگوں کا اجارہ ہے جن میں سے اکثر طلاء فروش ہیں۔

پنجاب کی پریس برانچ کے متعلق میں ''ایں دفتر بے معنی'' نہیں کہہ سکتا' اس لیے کہ یہ دفتر اپنے معنی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نکالتا رہتا ہے۔ چند برسوں سے اس کے معنی یہ ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کے بعد خدائے عزوجل نے ادب کے تمام دروازوں میں تالے ڈال کر ساری چابیاں ایک نیک بندے کے حوالے کر دی ہیں۔ کاش علامہ مرحوم زندہ ہوتے!

پولیس کی عدالتیں تو خیر پولیس کی عدالتیں ہیں۔ اندھی روح اور گنجے فرشتے۔ اس اندھی روح' گنجے فرشتوں اور پنجاب کے طلاء فروش اخبار والوں اور رسالوں کے مالکوں اور ان کے مریض ایڈیٹروں کی بدولت ایک بار پھر مجھے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا جسے جگت کے طور پر ضلع کہتے ہیں۔

اب کا مقدمہ ساقی بک ڈپو دہلی کی شائع کردہ کتاب ''دھواں'' پر تھا۔ الزام وہی فحاشی کا تھا۔ دو افسانے زیر عتاب تھے۔ کتاب کا پہلا افسانہ ''دھواں'' اور ''کالی شلوار'' پر عرصہ ہوا' قانونی پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور سیشن کورٹ میں یہ فحاشی سے مبرا قرار دی جا چکی

تھی۔ معلوم نہیں ایک بار پھر اس بے ضرر افسانے پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۴ کیوں آزمائی گئی۔ اس دفعہ معاملہ کچھ زیادہ سنگین معلوم ہوا کیونکہ میرے اور مسٹر شاہد احمد دہلوی (مالک ساقی بک ڈپو) کے علاوہ کاتب بھی گرفتار کر لیا گیا جس نے ''دھواں'' لکھنے کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ کتب فروش بھی گرفتار کئے گئے جن کے پاس یہ ملعون کتاب موجود تھی۔ پریس جس میں چھپی تھی' اس کا مالک بھی دھر لیا گیا۔ میں سلیقے کا بہت قائل ہوں۔ ناگوار سے ناگوار چیز بھی اگر سلیقے کے ساتھ کی جائے تو مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ لاہور سی آئی ڈی کے ایک سب انسپکٹر نے جس کا نام شاید رام سروپ تھا' مجھے ۵ دسمبر ۱۹۴۴ء کو گورے گاؤں سے ''ملاڈ'' پولیس اسٹیشن بلوایا اور بغیر وارنٹ دکھائے گرفتار کر لیا۔ میں نے وارنٹ کے متعلق استفسار کیا تو رام سروپ نے کہا۔ ''پرائیویٹ کاغذات میں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔'' یہ حرکت مجھے بری معلوم ہوئی' چنانچہ میں نے شام کو گھر آ کر اپنے سولسٹر کو ٹیلیفون کیا جس نے مجھے بتایا کہ میری گرفتاری غیر قانونی ہے' اس لیے حسب الحکم لاہور کی عدالت میں حاضر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن ۸ جنوری ۱۹۴۵ء کو مجھے میرے مکان پر رات کے دس بجے قانونی طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ عصمت چغتائی (مسز شاہد لطیف) کے ساتھ بھی قریب قریب یہی سلوک ہوا۔

۴ فروری ۱۹۴۵ء کے ''قومی جنگ'' (بمبئی) میں ''یہ ادب اور تہذیب پر حملہ ہے'' کے عنوان سے ایک مضمون علی سردار جعفری کے قلم سے شائع ہوا جس کی ابتدائی سطور یہ ہیں۔

''اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نام بہت مشہور ہیں۔ حال ہی میں منٹو کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ ''دھواں'' اور عصمت کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ ''چوٹیں'' دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ان مجموعوں میں دونوں افسانہ نگاروں کی بعض بہت اچھی کہانیاں شامل ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ حکومت پنجاب نے عصمت اور منٹو کے بعض افسانوں کو عریاں قرار دیا ہے۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ عتاب کون کون سے افسانے پر نازل ہوا ہے' لیکن دونوں کتابیں زد میں ہیں۔ مقدمے کی سماعت ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے۔ اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں ۲ فروری کو عصمت اور منٹو کی پیشی ہونے والی ہے۔''

لیکن عدالتی کارروائی سے پہلے ہی ان دونوں پر بہت کچھ گزر گئی۔ دسمبر ۱۹۴۴ء کو بمبئی کی پولیس نے عصمت چغتائی کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کر لیا اور ایک ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ ۶ دسمبر کو عصمت کو دادر پولیس کورٹ میں حاضری دینی پڑی اور انہیں حکم ملا کہ ۶ جنوری ۱۹۴۵ء کو دوبارہ حاضر ہوں۔ جنوری میں پنجاب سے عصمت کا وارنٹ آ گیا اور انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ دو ہزار روپے کی ضمانت دے کر گلو خلاصی ہوئی اور حکم ملا کہ عصمت ۲ فروری کو لاہور کے اسپیشل مجسٹریٹ کے عدالت میں جا کر حاضری

دیں۔ تقریباً یہی حشر سعادت حسن منٹو کا ہوا۔

سعادت حسن منٹو کا حشر کچھ زیادہ ہی قابل رحم تھا۔۔۔۔۔۔

مجھے ان دنوں اعصابی درد کی شکایت تھی۔ گھر میں رات کے دس بجے جب مجھے گرفتار کیا گیا تو میں مارے درد کے کراہ رہا تھا۔ سینے پر گرم بوتل تھی لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات لاہور حاضر عدالت ہونا ہی پڑا۔

اس دفعہ مقدمہ رائے صاحب لالہ سنت رام اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔

ایک لطیفہ سن لیجیے!

عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے ایک ادھیڑ عمر کے شریف سے صاحب آئے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا اسم گرامی؟''

ادھیڑ عمر کے شریف صاحب نے جواب دیا۔ ''نانک چند ناز''

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ ''معاف کیجیے' مجھے آپ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔''

لالہ نانک چند ناز استغاثہ کے معزز ترین گواہ تھے جو میرے اور عصمت چغتائی دونوں کے خلاف بھگتے۔۔۔۔۔۔آپ واقعی بھگتے۔

ایک اور لطیفہ سن لیجیے!

لالہ جی نے عصمت کے افسانے ''لحاف'' کے متعلق کہا کہ اس میں گندے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

ہمارے وکیل مسٹر ہیرالال نے پوچھا۔ ''مثلاً؟''

لالہ جی نے ''چوٹیں'' اٹھالی۔ کافی دیر ''لحاف'' کی ورق گردانی کے بعد ایک لفظ نکلا۔ ''عاشق''

ہم سب مسکرا دیے۔ مسٹر ہیرالال نے لالہ جی سے کہا۔ ''یہ لفظ گندا ہے تو آپ اس کی جگہ کوئی دوسرا تجویز کر دیجیے۔''

لالہ جی سوچنے لگے۔

مسٹر ہیرالال نے پوچھا۔ ''یار' کیسا رہے گا؟''

اس دفعہ رائے صاحب لالہ سنت رام بھی مسکرا دیے۔

جب تک استغاثے کے گواہ پیش ہوتے رہے ایسی مسکراہٹیں جاری رہیں۔ لیکن عدالت برخاست ہونے سے پہلے جب ہمارے وکیل نے درخواست پیش کی کہ مجھے اور عصمت کو آئندہ پیشیوں میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا جائے اور جب مجسٹریٹ صاحب نے اسے مسترد کر دیا تو ہم دونوں کو یہ تکلیف دہ احساس ہوا کہ ہم عدالت میں پیش تھے اور ہم پر فحاشی کا سنگین جرم عائد تھا۔ مجھے اس کا بھی شدید احساس ہوا کہ سخت سردی ہے اور میں اعصابی درد میں مبتلا ہوں۔

عدالت سے باہر مسٹر ہیرالال سے مشورہ کیا گیا۔ ایک ہی صورت تھی کہ ہائیکورٹ میں اپیل کی جائے۔۔۔۔۔ جو فوراً ہی داخل کر دی گئی۔ دوسرے روز میں اور عصمت آنریبل جسٹس اچھرورام کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ''مجھے آپ دونوں کے افسانے بہت پسند ہیں۔'' ہمیں بہت خوشی ہوئی لیکن انہوں نے اپیل کے کاغذات آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں منتقل کر دیئے۔

اب پھر دوسرے روز حاضر ہونا تھا۔ شام کو میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ اتفاق سے میرا بھانجا میجر عبدالوحید ان دنوں لاہور کے ملٹری ہسپتال میں متعین تھا۔ اس نے میرا ایکسرے لیا اور بتایا کہ مجھے ہائیڈرو نیوموتھوریکس ہے۔ یعنی میرے داہنے پھیپھڑے کے ایک حصے میں پانی اور ہوا داخل ہوئی ہے۔

میجر وحید کے کہنے پر میں نے دوسرے روز صبح سویرے کرنل امیر چند سے بھی تشخیص کرائی۔ انہوں نے وہی مرض بتایا اور رائے دی کہ مجھے آرام کرنا چاہیے۔ میں نے ان سے سرٹیفکیٹ لے لیا کہ شاید کام آ جائے' داشتہ آید بکار۔

دوسرے روز آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں پیش ہوا۔ عصمت غیر حاضر تھیں۔ جسٹس دین محمد صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑائے۔ ''ان لوگوں کا وجود ننگ ادب ہے۔'' مجھے ایسا لگا جیسے میری قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے۔ انہوں اپیل منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب میں نے اپنے وکیل سے کرنل امیر چند کا سرٹیفکیٹ پیش کرنے کے لیے کہا تو اپیل ایک قہر آلود دستخط سے منظور کر دی۔ میں بمبئی واپس چلا آیا۔

بمبئی میں بہت دیر تک ڈاکٹروں میں یہ بحث ہوتی رہی کہ میرا مرض کیا ہے۔ میجر وحید اور کرنل امیر چند کی تشخیص کہتی تھی کہ مجھے ''ہائیڈرو نیوموتھوریکس'' ہے لیکن ڈاکٹر لیملا اور ڈاکٹر ایف ڈبلیو برجر (یا برگر) کی ایکسرے دیکھنے کے بعد یہ رائے تھی کہ صرف ''نیوموتھوریکس'' ہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر ایچ پی مودی سے جو ریڈیالوجی کے ماہر ہیں' رجوع کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے میرا پرانا ایکسرے دیکھنے اور نیا امتحان لینے کے بعد ڈاکٹر ایف ڈبلیو برجر (یا برگر) کو خط لکھا۔

''مریض اس وقت نارمل حالت میں ہے۔ نیوموتھوریکس اور سیال مادہ بالکل غائب ہے۔ یہ کیس جیسا کہ ظاہر ہے سپائنٹنس ''نیوموتھوریکس'' کی قبیل سے تھا' ایسے چند کیس بعض اوقات ''کوخ'' میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔''

اس ''کوخ'' کا مطلب مجھے لاہور میں میجر وحید نے بتایا جب میں اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ ایسے چند کیس بعض اوقات دق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن دق اور زچ میں اس وقت ہوا جب میں نے صفائی کے گواہوں کی فہرست تیار کی' اور رائے صاحب لالہ سنت رام نے ان کی گواہی بذریعہ کمیشن لینے سے انکار کر دیا۔ کوئی گواہ حیدر آباد میں تھا' کوئی لکھنو میں اور کوئی بمبئی میں۔ لیکن رائے صاحب مصر تھے کہ سب کے سب لاہور میں حاضر ہوں۔ مکرمی نیاز فتح پوری صاحب کو جب لکھنو میں اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے لکھا۔ ''یقیناً کمیشن کے ذریعے شہادت قلمبند ہو سکتی تھی اور اس میں بڑی آسانی تھی۔ تعجب ہے مجسٹریٹ نے اسے منظور نہیں کیا اور آپ کے مشیر قانون نے کیوں اس پر زور نہ دیا۔''

مجھے معلوم نہیں مسٹر ہیرالال نے اس پر زور دیا تھا یا نہیں' بہر حال رائے صاحب لالہ سنت رام کا فیصلہ اٹل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر ''پیام'' حیدر آباد' لیفٹیننٹ کرنل قریشی (آئی ایم ایس بمبئی) نیاز فتح پوری صاحب ایڈیٹر ''نگار'' لکھنو' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے' ایل ایل بی' پی ایچ ڈی (پرنسپل) امر سنگھ کالج سری نگر' مسٹر ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے' بمبئی جیسے اہل الرائے صاحبان کے خیالات سے نہ صرف میں بلکہ عدالت بھی محروم رہی۔

میں نے ان کو اور دوسرے حضرات کو گواہی کی دعوت ان الفاظ میں دی تھی۔



بمبئی' ۳۰ ستمبر

مکرمی!

تسلیمات' لاہور کی عدالت میں میرے ایک افسانے ''دھواں'' پر فحاشی کا الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے آپ کو گواہ صفائی کے طور پر بلایا ہے۔ متذکرہ صدر افسانے کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہو' مجھے منظور ہو گی' اس لیے فحاشی اور غیر فحاشی کے اہم موضوع پر آپ جیسے اہل الرائے ادیب اور صاحب قلم کے خیالات نہ صرف میرے لیے بلکہ ملکی ادب کے لیے مفید ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ دعوت قبول فرمائیں گے۔ شکریہ!

(نیاز کیش ۔۔۔۔۔ سعادت حسن منٹو)



سب نے میری دعوت قبول کی جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری ''انجمن ترقی اردو' ہند نے میرے عریضے کا جواب نہ دیا۔ بہت ممکن ہے ان تک پہنچا ہی نہ ہو۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ''ریاست'' کی طرف سے جب مجھے کوئی رسید نہ آئی تو مجھے بہت غصہ آیا۔ کیونکہ مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے۔ میں نے پھر ان کو لکھا' جواب آیا۔

''آپ کا دوسرا خط ملا' میرا داخلہ پنجاب میں بند ہے' اس لیے شہادت کیسے دوں۔ یہی میں نے سمن پر لکھ دیا تھا۔ اگر مجسٹریٹ پنجاب گورنمنٹ سے اجازت لے لے میں تو جانے کے لیے تیار ہوں۔''

ایک اور لطیفہ سنئے!

بمبئی سے میں نے لاہور میں پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ کو گواہی دینے کے لیے لکھا۔ سمن ان کے پاس پہلے پہنچ چکے تھے۔ میرا خط انہیں دیر کے بعد ملا' چنانچہ انہوں نے ایک کارڈ لکھا۔

حضرت سلامت!

آپ کے وکیل سے ایک مرتبہ پہلے میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے نہ مقدمے کی وجہ بیان کی نہ یہ کہا کہ کس افسانے پر دھرے ہوئے ہو۔ چار کو پیشی تھی۔ دس بجے حاضر عدالت ہوا۔ سوا بارہ بجے تک دھوپ میں سڑتا رہا۔ ٹانگوں کو مسلتا اور بلغم نکالتا رہا۔ نہ جائے نشستن نہ اذن رفتن۔ سوا بارہ بجے بلوایا گیا۔ ''کیوں جی' وہ کہانیاں تم نے پڑھی ہیں؟'' ------- ''حضور' نہیں!'' ------- ''برخاست'' ------- لنگڑاتا لنگڑاتا گھر پہنچا۔ دیکھا کہ ایک بڑے پیکٹ والا لفافہ لیٹر بکس میں جھانک رہا ہے جس میں حضور کے ارشادات موجود تھے۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ آپ خفا نہ ہوں گے کہ ایک ہم پیشہ ''قلم مار'' نے یہ کیا حرکت کی۔ میں خفا ہوں کہ وکیل ست' موکل ست تو ------- منٹو کو ستی کی بیماری ہو' یقین نہیں آتا۔

اور مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ نے میری کہانیاں پڑھی ہی نہیں تھیں۔ غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ میں نے ''بڑے پیکٹ والے لفافے'' عین اس وقت بھیجے جب کہ سمن جاری ہو چکے تھے۔ ان لفافوں میں، میں نے اپنے اس تحریری بیان کی نقل بھیجی تھی جو میں نے عدالت میں دیا تھا۔ چونکہ اس بیان کا میری تحریروں سے گہرا تعلق ہے اس لیے میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

''میں ساقی بک ڈپو دہلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان ''دھواں'' کا مصنف ہوں۔ یہ کتاب میں نے ۱۹۴۱ء میں جبکہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا' ساقی بک ڈپو کے مالک میاں شاہد احمد دہلوی کو غالباً تین یا ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کی تھی۔ اس

کے جملہ حقوق اشاعت اب ساقی بک ڈپو کے پاس ہیں۔

اس کتاب کے جو نسخے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں' ان کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

چوبیس افسانوں کے اس مجموعے میں جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں' دو افسانے بعنوان ''دھواں'' اور'' کالی شلوار'' استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ یہ دونوں کہانیاں عریاں اور فحش نہیں ہیں۔

کسی ادب کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر' ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر' کسی خاص غرض کے تحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں' اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں کیونکہ کسی بڑے شاعر کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب وعواطف سے آگاہ ہو۔

استغاثے نے میرے ان دو افسانوں پر کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ دونوں افسانے فحش ہیں' اس آدمی کی جو روشنی کا خواہشمند ہے' جو اپنے عیوب ومحاسن جاننا چاہتا ہے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے ہرگز ہرگز تسکین نہیں ہوتی ۔۔۔۔۔۔ میں اگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ دونوں افسانے فحش نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ میں اندھیرے میں اور بھی اضافہ کر دوں گا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

زبان میں بہت کم لفظ فحش ہوتے ہیں۔ طریق استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کوئی بھی چیز فحش نہیں۔ لیکن گھر کی کرسی اور ہانڈی بھی فحش ہو سکتی ہے اگر ان کو فحش طریقے سے پیش کیا جائے۔ چیزیں فحش بنائی جاتی ہیں' کسی خاص غرض کے ماتحت۔

عورت اور مرد کا رشتہ فحش نہیں' اس کا ذکر بھی فحش نہیں' لیکن جب اس رشتے کو چوراسی آسنوں یا جوڑ دار خفیہ تصویروں میں تبدیل کر دیا جائے اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تخلیے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو میں اس فعل کو صرف فحش ہی نہیں بلکہ نہایت گھناؤنا' مکروہ اور غیر صحت مند کہوں گا۔ فحش اور غیر فحش میں تمیز کرنے کے لیے شاید مثال کام دے سکے۔

ایک آرٹ گیلری میں نمائش کے لیے ننگی عورتوں کی بہت سی تصویریں پیش ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی جیسا کہ ظاہر ہے دیکھنے والوں کا اخلاق خراب نہ کیا اور نہ ان کے شہوانی جذبات کو ابھارا۔ البتہ ایک تصویر جس میں عورت کا سارا بدن کپڑوں میں مستور تھا اور ایک خاص حصہ اس ترکیب سے نیم عریاں چھوڑ دیا گیا کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں گدگدی سی ہوتی تھی' فحش قرار دی گئی۔

کیوں ۔۔۔۔۔۔اس لیے کہ آرٹسٹ کی نیت میں فرق تھا اور اس نے جان بوجھ کر لباس کو کچھ اس طرح اوپر اٹھا دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ جائے اور وہ اپنے تصور سے مدد لے کر اس نیم عریاں حصے کو عریاں دیکھنے کی کوشش کریں۔

تحریر و تقریر میں‘ شعر و شاعری میں‘ سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے‘ اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر‘ وہ تقریر‘ وہ شعر‘ وہ بت‘ قطعی طور پر فحش ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ ترغیب ’’دھواں‘‘ میں موجود ہے یا نہیں۔۔۔۔۔۔۔ آیئے! ہم افسانے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

مسعود ایک کم سن لڑکا ہے غالباً دس بارہ برس کا۔۔۔۔۔۔۔ اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ ایک خاص فضا اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے‘ جو مسعود کے جسم میں دھندلے دھندلے خیالات پیدا کرتا ہے۔ ایسے خیالات جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری وہ سمجھ نہیں سکتا لیکن نیم شعوری طور پر محسوس ضرور کرتا ہے۔ بے کھال کا بکرا جس میں سے دھواں اٹھتا ہے۔ سردیوں کا ایک دن جب کہ بادل گھرے ہوتے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے۔ ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بہن‘ جس کی ٹانگیں وہ دباتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب عناصر مل کر مسعود کے بدن میں جنسی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھ نہیں سکتا اور انجام کار اپنی ہاکی اسٹک توڑنے کی ناکام سعی کرتا کرتا تھک جاتا ہے۔ یہ تھکاوٹ اس بے نام سی چنگاری کو ’’اس‘‘ کچھ کرنے کی تحریک کو دبا دیتی ہے۔

’’دھواں‘‘ میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت‘ ایک جذبے‘ ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دوراز کار باتیں نہیں کی گئیں۔ اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے اس لیے کہ افسانے کا موضوع ’’شہوت‘‘ نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو اس کی کم نظری ہے۔ خشخاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مرحلے طے کرتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا۔ اخلاقیات پر یہ کوئی لیکچر بھی نہیں کیوں کہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔ انسان اپنے اندر کوئی برائی لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور برائیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے داخل ہوتی ہیں۔ بعض ان کی پرورش کرتے ہیں‘ بعض نہیں کرتے۔ میرے نزدیک قصائیوں کی دکانیں فحش ہیں کیونکہ ان میں ننگے گوشت کی بہت بدنما اور کھلے طور پر نمائش کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک وہ باپ

اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقع دیتے ہیں جو دن کو بند کمروں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی سے سر دبوانے کا بہانہ لگا کر اس سے ہم بستری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کے اندر بہت کم سنی ہی میں جنسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک آپ کو میرے افسانے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں جنسی بیداری کا پیدا ہونا میرے نزدیک بہت ہی بھونڈی چیز ہے۔ یعنی اگر میں کسی چھوٹے بچے کو جنسیات کی طرف راغب دیکھوں تو مجھے کوفت ہو گی۔ میرے صناعانہ جذبات کو صدمہ پہنچے گا۔

افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیوں کہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن ''دھواں'' لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر' کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ دیکھ کر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہوگا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشتا ہے۔

افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی' خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا۔ یہ ایک اچھے فنکار کے قلم کی خوبی ہے۔ اس افسانے میں سے چند سطور پیش کرتا ہوں جس سے افسانہ نگار کے غایت درجہ محتاط ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی۔

(۱) مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ''ہائے ہائے'' کرنا شروع کیا۔

(۲) کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازی گر کو چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

(۳) بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا ''کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟'' ------- لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اس بات کے ضامن ہیں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت سے ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کمر دباتا ہے جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ ٹانگیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازی گر کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تماشا اس نے ایک بار اپنے سکول

میں دیکھا تھا۔ اور جب یہ سوچتا ہے کہ اس کی بہن ذبح کردی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا تو فوراً اسے بری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے۔

خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے' جس میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں۔ اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا۔۔۔۔۔۔۔ عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی' میز یا استرا نہیں کہہ سکتے۔ یوں تو بعض حضرات کے نزدیک عورت کا وجود ہی فحش ہے۔۔۔۔۔۔۔ مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کو بکری کا ایک معصوم بچہ ہی معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ دنیا میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے شہوانی لذت حاصل کرتے ہیں۔ اور ایسے انسان بھی آپ کو مل جائیں گے' لوہے کی مشینیں جن کے جسم میں شہوت کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں۔ مگر لوہے کی ان مشینوں کا جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں' کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح نہ بکری کے معصوم بچے کا' اور نہ مقدس کتابوں کا۔

ایک مریض جسم' ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی' ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں' اصل میں انہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے' افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں' ایسے انسانوں کے لیے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ جو کسی ادب پارے کو ایک ہی دفعہ نگل نہیں جاتے۔

روٹی کھانے کے متعلق ایک موٹا سا اصول ہے کہ ہر لقمہ اچھی طرح چبا کر کھاؤ' لعاب دہن میں اسے خوب حل ہونے دو تا کہ معدے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور اس کی غذائیت برقرار رہے۔ پڑھنے کے لیے بھی یہی موٹا اصول ہے کہ ہر لفظ کو' ہر سطر کو ہر خیال کو اچھی طرح ذہن میں چباؤ۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمہارے دماغ میں پیدا ہوگا' اچھی طرح حل کرو تا کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے' اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج برے ہوں گے جس کے لیے تم لکھنے والے کو ذمہ دار نہ ٹھہرا سکو گے۔ وہ روٹی جو اچھی طرح چبا کر نہیں کھائی گئی تمہاری بدہضمی کی ذمہ کیسے ہو سکتی ہے۔

میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ فرانس میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار گائی دی موپاساں گزرا ہے۔ جنسیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات نے اس کے افسانوں کا اپنی علمی کتابوں میں حوالہ دیا ہے۔ اپنے

ایک افسانے میں وہ ایک لڑکے اور لڑکی کی داستان بیان کرتا ہے جو بے حد الہڑ تھے۔ پہلی رات کے متعلق دونوں نے سنی سنائی باتوں سے ایک عجیب وغریب تصویر اپنے ذہن میں کھینچ رکھی تھی۔ دونوں اس خیال سے کپکپار ہے تھے کہ خدا معلوم کتنی بڑی لذت ان کو پہلی رات کے ملاپ سے ملے گی۔

دونوں کی شادی ہوگئی۔ دولہا ''ماہ عسل'' منانے کی خاطر دلہن کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں پہلی رات کو۔۔۔۔۔۔اس رات کو جس میں دونوں کے خیال کے مطابق شاید فرشتے اتر کر ان کو لوریاں دینے والے تھے' دولہا اور دلہن ہم بستر ہو گئے۔۔۔۔۔۔دونوں لیٹے تھے اور بس۔۔۔۔۔۔۔دلہن نے شامت اعمال سے اتنا کہہ دیا۔ ''بس۔۔۔۔۔۔۔کیا یہی ہماری رات تھی جس کے ہم دونوں اتنے شیریں خواب دیکھا کرتے تھے۔'' دولہا کو یہ بات کھا گئی' آخر مرد ہی تو تھا۔ اس نے سوچا یہ میری مردانگی پر حملہ ہے ۔۔۔۔۔۔۔چنانچہ اس کی مردانگی بالکل ہی ختم ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔عرق ندامت میں غرق وہ حجلہ عروسی سے باہر نکل گیا' اس غرض سے کہ اپنی ناکام زندگی کسی دریا کے سپرد کر دے۔ عین اس وقت جب یہ نیا نویلا دولہا اس خطرناک فیصلے پر پہنچا' فرانس کی ایک کسبی ۔۔۔۔۔۔۔ایک ویشیا پاس سے گزری جو غالباً گاہک تلاش کر رہی تھی۔ اس عصمت باختہ عورت نے اس کو اشارہ کیا۔ دولہا نے محض انتقام لینے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔ساری عورت ذات سے بدلہ لینے کے لیے اس کو اس اشارے کا جواب دیا کہ ہاں میں تیار ہوں۔ وہ ٹکھیائی اسے اپنے گھر لے گئی۔ اس کے غلیظ گھر میں دولہا وہ کام کرنے میں کامیاب ہوگیا جو وہ اپنے نفیس ہوٹل کے حجلہ عروسی میں نہ کر سکا تھا۔۔۔۔۔۔اب وہ اس ویشیا کو بھول گیا۔۔۔۔۔۔دوڑا دوڑا اپنی نئی بیاہتا بیوی کے پاس پہنچا جیسے اسے کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے۔۔۔۔۔۔دونوں پاس پاس لیٹے تھے مگر اب اس کی بیوی کو وہ شیریں خواب دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی تھی جس کا اس نے پہلے گلہ کیا تھا۔

یہ افسانہ پڑھ کر اگر کوئی شخص جو پہلی رات ناکام رہا ہو' سیدھا ویشیا کے کوٹھے کا رخ کرے تو میں سمجھتا ہوں اس جیسا چغد اور کوئی نہیں ہوگا۔ میرے ایک دوست نے یہی بیوقوفی کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنا کھویا ہوا وقار تو مل گیا پر اس کے ساتھ ہی ایک مکروہ مرض چمٹ گیا جس کے علاج کے لیے اسے کافی زحمت اٹھانا پڑی۔

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو' بمبئی سے ایک تقریر نشر کی تھی۔ اس میں' میں نے کہا تھا۔

''ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا۔ اپنی ذاتی خواہشوں' خوشیوں' رنجشوں' بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے آنسو اس کی دکھی

بہن کے ہوں، مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے۔ اس لیے اپنی مسکراہٹوں، اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا ایک خاص اثر ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ خاص اثر اور یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی۔"

میں ایک زمانے سے لکھ رہا ہوں۔ گیارہ کتابوں کا مصنف و مولف ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر اسٹیشن سے میرے ڈرامے اور فیچر براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ میں تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں۔ میرے قلم سے بے ادبی شاذ و نادر ہی ہو سکتی ہے۔ میں فحش نگار نہیں، افسانہ نگار ہوں۔

دوسرے افسانے "کالی شلوار" کے متعلق میں نے اس لیے کچھ نہیں کہا کہ لاہور کی سیشن کورٹ میں اسے فحاشی سے بری قرار دیا جا چکا ہے۔"

میرے اس بیان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ صفائی کے گواہوں میں ڈاکٹر سعید اللہ، ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی، پروفیسر کنہیالال کپور، ایم اے، ایل ایل بی، ڈاکٹر آئی لطیف ایم اے، پی ایچ ڈی، مولانا باری علیگ، دیوندر ستیارتھی جیسے اہل الرائے ہستیاں موجود تھیں۔ ان حضرات نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے سارا سارا دن عدالت میں گزار کر میرے حق میں گواہی دی اور کہا کہ زیر عتاب افسانوں میں فحاشی کا شائبہ بھی موجود نہیں۔ لیکن رائے صاحب لالہ سنت رام نے دونوں افسانے فحش قرار دیے اور مجھے دو سو روپیہ جرمانہ ادا کرنے کی سزا دی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں کتنے مہینوں کی قید بامشقت تھی، تھی یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں۔ میں نے جب اپنی جیب سے دو سو روپے نکالے تو اسپیشل مجسٹریٹ صاحب کے ہونٹوں پر ایک اسپیشل مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آپ نے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے تھے۔"

باوجود کوشش کے میرے ہونٹوں پر اسپیشل مسکراہٹ پیدا نہ ہو سکی۔ سیشن میں اپیل کی گئی۔ پیروی مسٹر ہیرالال سبیل نے کی۔ کئی مہینے گزرنے پر ایک روز ان کا تار آیا کہ مبارک ہو، سیشن کورٹ نے اپیل منظور کر لی۔ جرمانہ واپس ہو جائے گا۔

تیسری دفعہ انجام بخیر ہوا۔

ایک اور لطیفہ سنئے۔۔۔۔۔۔

چند روز ہوئے، ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے نوکر سے کہا۔ "پوچھو کون ہے؟"

جواب آیا۔ "سی آئی ڈی کا آدمی"

ظاہر ہے کہ لاہور سے گرفتاری کا وارنٹ تھا لیکن جب میں اس سی آئی ڈی کے آدمی سے ملا اور اس سے کہا۔ ''فرمایئے! اب کی میری کس کہانی پر عتاب نازل ہوا ہے۔''

تو وہ جیسے کچھ سمجھا ہی نہیں' کہنے لگا۔ ''ہم تپاس (پوچھ گچھ) کرنے آیا ہے' تمہارا نام ادھر کیمونسٹ پارٹی کے آفس میں چوپڑی (کتاب) میں لکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بولو' تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟''

یہ سن کر مجھے تسلی ہوئی اور مذاق سوجھا۔ ''چوپڑی سے' کیمونسٹ پارٹی سے؟''

''کیمونسٹ پارٹی سے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''تعلق ہے، مگر ناجائز''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تمہاری حکومت یہی سمجھتی ہے۔ ورنہ تم یہاں تپاس کرنے کیوں آتے؟''

یہ قصہ بھی ختم ہوا۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے لاہور کی ایسی عدالت میں جہاں شریف انسانوں کو بیٹھنے کے لیے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی بھی نہیں ملتی' گھنٹوں اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے بھینسوں کے آگے بین بجائی۔

مسٹر اے ایس بخاری کا بھی ممنون و متشکر ہوں۔ متذکرہ صدر مقدمے کے بعد یا اس سے کچھ دیر پہلے' آپ نے بمبئی ریڈیو اسٹیشن میں مجھے بلایا اور بڑی شفقت سے بتایا کہ وہ اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر میرے اور عصمت کے عتاب زدہ افسانوں کے متعلق ہندوستان کے مشہور ادیبوں کی رائے مرتب کرنے والے ہیں اور یہ کہ انہوں نے لاہور میں عدالت سے بیانات وغیرہ کی نقل لینے کے لیے ایک آدمی بھی متعین کر دیا ہے۔

یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے اتفاق سے میرا افسانہ نہیں پڑھا تھا' چنانچہ ان کے ارشاد کے مطابق ایک جلد اس کتاب کی ان کو دہلی روانہ کر دی۔ اس ملاقات کو تقریباً ایک برس ہو چکا ہے' امید ہے بخاری صاحب نے اپنا کام ختم کر لیا ہو گا۔

(بمبئی' ۷ ۲ فروری ۱۹۴۷ء)



بو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس سپرنگوں والے پلنگ پر جواب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سرکا دیا گیا تھا۔ ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی تھی۔ وہ شام کے قریب دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لیے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ کھانس کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھوکریاں جو پہلے سستے داموں پر مل جاتی تھیں۔ عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ سکول کھول لئے تھے۔ جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی۔ رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ رندھیر جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا۔ صرف اس لئے اس پر فورٹ کے اکثر قحبہ خانوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے کہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑی اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اس کی تازہ تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو وردی پہن کر اور اپنے کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے

زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے اس میں کوئی شک نہیں وہ اپنے جسم کی تمام قابل نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کئے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلائے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا کہیں ایسا نہ ہو بیچاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا۔ ”سردی لگ جائے گی۔“

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا' جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ ابھر آیا تھا۔ کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی' جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک کر ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ ”میں کیا کروں' نہیں کھلتی۔“

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا۔ دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی' رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لحظہ کے لئے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابک دست کمہار کی طرح دو پیالوں شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ' وہی جاذبیت' وہی طراوت' وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے

ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹمیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی۔ سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی تھی۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ انہوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیونکہ جو کچھ انہیں کہنا سننا تھا' سانسوں' ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جوان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اس ہوائی لمس سے بھی جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے لئے کپکپا اٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الہڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سنانا چاہئیں' وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بو آتی رہی تھی۔ اس بو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی۔ وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے' اس کی چھاتیوں سے' اس کے بالوں سے' اس کے پیٹ سے ہر جگہ سے یہ بو جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی رندھیر کے ہر سانس میں موجود ہوتی تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی' اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بو نہ اڑتی۔ یہ بو جو اس کے دل و دماغ کے ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی۔ اس کے تمام

پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے۔ جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی۔ جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلتی تھی۔ رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے لیکن نہیں، وہ بو کچھ اور ہی قسم کی تھی، اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی، عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبودار پاؤڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بو دب جائے لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار، ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی۔ بلکہ عجیب قسم کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بو نکلتی تھی جو غائت درجہ قابل فہم ہونے کے باوجود نا قابل فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے۔ یہی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کر نہا رہے تھے۔ ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی۔ جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ جب رندھیر کے اس کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے۔ موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر رہی تھی مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔ دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی۔ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سرخ ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پلنگ پر اس کے دوسرے رکھے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہرے پھولوں والی قمیص انگیا، جانگیا اور دوپٹہ سب کا رنگ سرخ تھا،

بے حد سرخ' یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے' سرخی اور مقیش کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب وغریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ بے جان سا' اڑا اڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچے رنگ نے جا بجا لال لال دھبے ڈال دیئے تھے۔

چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے۔ جس کے باعث وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا۔ کیا ایسا نہیں لگتا' جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھاڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے' کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح۔ کیوں کہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ملنے جلنے سے خراشیں آجاتی ہیں ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں' پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے اردگرد کس کر باندھے ہوئے ازار بند کا نشان' وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نیکلس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئی تھیں جیسے ناخنوں سے بڑے زور کے ساتھ کھجایا گیا ہے۔ برسات کے وہی دن تھے۔ پیپل کی نرم نرم کومل پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی' جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات سنتا رہا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کی عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کر طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا تھا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی تھی۔ لیکن وہ پکار کہاں تھی۔ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سونگھی تھی۔ وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے کہیں زیادہ قابل فہم تھی۔ وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے۔ مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دور بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں اسے مٹمیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی۔ ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی تھی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا' لیٹی تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ جو اب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالت نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جس طرح بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس' بے رنگ' بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا' جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں' اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی' سفید سفید دھبوں کی صورت میں ۔۔۔۔۔۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکل رہی تھی۔ وہ بو جو حنا کے عطر سے زیادہ کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دوررس تھی۔ جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا جو خود بخود ناک کے رستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخر کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا' مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی' جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی' رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی۔ وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جبکہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے' اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔



دھواں

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا اس میں تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔ پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی۔

سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی۔ لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی۔ جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ویسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آوازیں مدھم تھیں۔ جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں۔ ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی، جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے۔ کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ

ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ سب بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں۔ اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے ابا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ

سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا۔ جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا۔ ''امی جان' آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا تھا۔''

''اچھا!'' یہ کہہ کر اس کی ماں چولہے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

''ہاں! اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔''

''اچھا!'' یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

''اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا۔''

''اچھا'' مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ '' کیسے پھڑکتا تھا؟''

''یوں ۔۔۔۔۔۔ یوں!'' مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

''پھر کیا ہوا؟''

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے اس طور نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ ''پھر کیا ہونا تھا! میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا' گرم تھا۔''

''گرم تھا...... اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے۔''

''بتایئے!''

''آؤ میرے ساتھ آؤ۔''

نہیں پہلے آپ بتایئے' کام کیا ہے۔''

''تم آؤ تو سہی میرے ساتھ!''

''جی نہیں' آپ پہلے کام بتایئے۔

دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔میں پلنگ پر لیٹتی ہوں۔تم ذرا پاؤں سے دبا دینا۔اچھے بھائی جو ہوئے۔اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔''

یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

''یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔جب دیکھو درد ہو رہا ہے اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں۔کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔''مسعود اٹھ کھڑا ہوا اور راضی ہو گیا۔''چلئے' لیکن آپ سے یہ کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ بالکل نہیں دباؤں گا۔''

''شاباش' شاباش۔''اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی۔ جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور آسمان کی طرف دیکھا۔مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے۔

''مسعود آج ضرور بارش ہوگی۔''یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔''دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔''

''بہت اچھا' لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ادھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ' ورنہ یاد رکھو۔۔۔۔۔۔بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔''کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ''ہائے ہائے'' کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولہوں پر گوشت زیادہ تھا۔جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے۔جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے۔اس قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت

محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھینچی بھینچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے۔ مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ ''شاباش مسعود شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو۔ بالکل اسی طرح شاباش میرے بھائی۔''

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری ہوگئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا' لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی تڑپ منجمد سی ہوگئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے' چنانچہ اس نے کہا۔ ''یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا' سیدھی لیٹ جایئے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔''

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوتی تھی' اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ ''نا بھائی میرے گدگدی ہوتی ہے تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو۔''

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ ''نہیں' اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا' آپ اطمینان رکھئے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز میں سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہوگیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیر چلانے شروع کئے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟ لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

''بس بس!'' کلثوم تھک گئی۔ ''بس بس!''

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور وہ تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھیلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہار رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں پلٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا' جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے۔ جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک

دوبارہ اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔اس کے جسم کے کسی حصے میں' یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں' کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی۔۔۔۔۔۔۔اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔اس کا سارا جسم کھینچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے سے ہوتا ہوا صحن میں آ نکلا۔کوئی باورچی خانے میں تھا نہ صحن میں۔ادھر ادھر جتنے کمرے تھے۔سب کے سب بند تھے بارش اب رک گئی تھی۔مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی۔"کون؟"

"جی میں ہوں مسعود!"

اندر سے آواز آئی۔"کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں۔"

"کھیلو' پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا۔"تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔زیادہ شور نہ مچانا۔"

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم باز۔مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے۔دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں۔خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا' جس نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر بھی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر تو ہینڈل چناخ سے ٹوٹ جائے گا۔اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔جب تھک ہار گیا تو جھنجلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔



کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی۔ جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی' ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ ''دس لیف۔۔۔۔ ویری بیڈ'' یعنی یہ زندگی بہت بری ہے۔ جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔''

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی۔ ''صاحب! ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔'' اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی۔ ''صاحب! تم ایک دم الو کا پٹھا ہے' حرامزادہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ سمجھا!'' یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی' ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہوئے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے' صرف چھ۔۔۔۔۔۔۔ یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا تھا۔ ''بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے۔'' جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے کہا۔ ''دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی' اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو نہ ہوگا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔'' چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار

نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ ''لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔'' اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا۔ جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص اہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں' یہ زنجیر اسی لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا' اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا تو ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ چیخ تمہاری تھی؟''

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ موا پاخانہ ہے یا کیا ہے' بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد ہو رہا تھا' میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔''

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پاخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا' یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس لیے اس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالہ چھاؤنی میں قائم کر لیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوشحال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا۔جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں۔ اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کی ایک پکی نشانی مل گئی۔ ''یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔'' یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں

''کوئلوں کی دکان'' لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں ''شرفاء کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے'' لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔۔۔۔۔۔ پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا۔ ''کیا بات ہے خدا بخش! پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے' کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے' پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔'' خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا۔ ''میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔'' وہ اس سے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا۔ جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تین مہینے میں چھ' جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی کے ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ' کھانا پینا' کپڑے لتے دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالہ میں بنوائی تھیں' آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔ ''تم میری سنو اور چلو واپس انبالہ۔۔۔۔۔۔۔ یہاں کیا دھرا ہے؟۔۔۔۔۔۔ بھئی ہو گا' پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا' چلو وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔''

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔ ''نہیں جان من! انبالہ نہیں جائیں گے' یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔

یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا' پر کیا کرتی پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی' پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اور اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی۔ کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھیرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے۔ جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔ ''دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔'' مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ ''جان من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا۔''

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھیں۔ جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لیے گرد و غبار دب

گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا۔ ”آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے؟“ وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟“ اس پر سلطانہ نے کہا۔ ”یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔“ وہ یہ سن کر پھر مسکرایا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا۔ ”آپ جا رہے ہیں؟“ اس آدمی نے جواب دیا۔ ”نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں' چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔“

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھائے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام شنکر ہے۔“

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا۔ ”فرمائیے!“

شنکر بیٹھا تھا' یہ سن کر لیٹ گیا۔ ''میں کیا فرماؤں' کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمھیں نے ہے مجھے۔'' جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ ''میں سمجھا' لو اب مجھ سے سنو جو کچھ تم نے سمجھا' غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔''

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ''آپ کیا کام کرتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا۔ ''یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔''

''کیا؟''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔۔۔۔میں کچھ بھی نہیں کرتی۔''

''میں بھی کچھ نہیں کرتا۔''

سلطانہ نے بھنا کر کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔''

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔''

''جھک مارتی ہوں۔''

''میں بھی جھک مارتا ہوں۔''

''تو آؤ دونوں جھک ماریں۔''

''حاضر ہوں' مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔''

''ہوش کی دوا کرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ لنگر خانہ نہیں۔''

''اور میں بھی والنٹیر نہیں۔''

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا۔ ''الو کے پٹھے''

''میں الو کی پٹھی نہیں۔''

''مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدارسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جارہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔'' یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا۔ ''تم ہندو ہو؛ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔''

شنکر مسکرایا۔ ''ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔''

''جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ بولو رہو گے؟''

''اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔''

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تو جاؤ رستہ پکڑو۔''

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔ ''میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت کام کا آدمی ہوں۔''

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالہ میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اسے پوچھا۔ ''تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟''

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''پرانے قلعہ کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔''

''کچھ انہوں نے تم سے کہا؟''

''نہیں! ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔۔۔۔۔۔۔۔ پر سلطانہ! میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔ ''سارا سارا دن غائب رہتے ہو۔

میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جاسکتی ہوں نہ آسکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے' کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ' کیا ہوگا؟ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے؟ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔''

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا۔ ''پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔ خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوسکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے' اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم ۔۔۔۔۔۔''

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے' اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔ میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔''

خدا بخش اٹھ بیٹھا۔ ''اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جا رہی ہو۔ میں کہاں سے لاؤں گا۔ افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔''

''کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔''

''دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔''

''لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ۔۔۔۔۔۔۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟''

''اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔'' یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ ''لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔''

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی

ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں۔ جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کو بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی بتیاں روشن ہو رہی تھیں نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اسے شنکر نظر آیا مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ ''تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔''

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ''نہیں بیٹھو تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔''

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ ''تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔''

''کیسی شرطیں؟'' سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ ''کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟''

''نکاح اور شادی کیسی؟ .... نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔ چھوڑو ان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔''

''بولو کیا بات کروں؟''

''تم عورت ہو........ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔''

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔ ''صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''جو دوسرے چاہتے ہیں۔'' شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔''

''تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں' خود سمجھنا چاہئیں۔''

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی' پھر کہا۔ ''میں سمجھ گئی۔''

''تو کہو' کیا ارادہ ہے؟''

''تم جیتے میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں' آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔''

''تم غلط کہتی ہو۔ اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے۔ جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ------- تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟''

''سلطانہ ہی ہے۔''

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ ''میرا نام شنکر ہے۔ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔''

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر' جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ ''شنکر میری بات مانو گے؟''

شنکر نے جواباً کہا۔ ''پہلے بات بتاؤ۔''

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ ''تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر -------''

''کہو کہو رک کیوں گئی ہو؟''

سلطانہ نے جرات سے کام لے کر کہا۔ ''بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔''

شنکر نے یہ سن کر کہا۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔''

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔ ''نہیں' میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔''

شنکر مسکرایا۔ ''میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار

مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہوگئیں۔'' سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا۔''کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟''

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔''تم انہیں کیا کرو گے؟ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔''

اس پر شنکر نے کہا۔''میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ان کی قیمت نہیں پوچھی۔بولو دیتی ہو؟''

''لے لو'' یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیے۔اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا۔''ساٹن کی کالی شلوار ہے ۔۔۔۔۔۔دیکھ لینا شاید لمبی ہو۔۔۔۔۔۔۔اب میں چلتا ہوں۔''

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔بال بکھرے ہوئے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔سلطانہ بہت خوش تھی۔بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا' اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی۔تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

''قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے پر یہ شلوار نئی ہے۔۔۔۔۔۔کب بنوائی؟''

سلطانہ نے جواب دیا۔''آج ہی درزی لایا ہے۔یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔''یہ بندے تم نے کہاں سے منگوائے ہیں؟''

مختار نے جواب دیا۔''آج ہی منگوائے ہیں۔''

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔



سفید جھوٹ

ماہوار رسالہ ''ادب لطیف'' لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں میرا ایک افسانہ بعنوان ''کالی شلوار'' شائع ہوا تھا جسے لوگ فحش سمجھتے ہیں' یہ سفید جھوٹ ہے۔

افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر میں کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی فحش نہیں۔ میں آئندہ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فحش نہیں ہوں گے۔

قصہ گوئی ہبوط آدم سے جاری ہے۔ اور میرا خیال ہے قیامت تک جاری رہے گی۔ اس کی شکلیں بدلتی جائیں گی۔ لیکن انسان اپنے احساسات دوسرے اذہان تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ بیسواؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے' اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہر اس شے کے متعلق لکھا یا کہا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو۔ بیسوائیں اب سے نہیں ہزار ہا سال سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا تذکرہ الہامی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اب چونکہ کسی الہامی کتاب یا پیغمبر کی گنجائش نہیں رہی' اس لیے موجودہ زمانے میں ان کا ذکر آپ آیات میں نہیں بلکہ اخباروں' رسالوں یا کتابوں میں دیکھتے ہیں جنہیں آپ عود اور لوبان جلائے بغیر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے بعد ردی میں بھی اٹھوا سکتے ہیں۔ میں ایک ایسا انسان ہوں جو ایسے رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہے اور اس لیے لکھتا ہے کہ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں' جس نظر اور جس زاویے سے دیکھتا ہوں' وہی نظر' وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اگر تمام لکھنے والے پاگل تھے تو آپ میرا شمار بھی ان پاگلوں میں کر سکتے ہیں۔ ''کالی شلوار'' کا پس منظر ایک ویشیا کا گھر ہے۔ یہ گھر بئے کے گھر کی طرح حیرت انگیز نہیں جس کے متعلق عجیب وغریب باتیں مشہور ہیں۔ دہلی میں ایسی عورتوں کے لیے ایک مقام منتخب کر کے بے شمار گھر بنائے گئے ہیں۔ میری سلطانہ ایسے ہی ایک بنے بنائے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے بئے کی طرح یہ گھر خود نہیں بنایا تھا۔ وہ بئے کی طرح رات کے جگنو پکڑ پکڑ کر اپنا گھر روشن نہیں کرتی۔ روشنی پیدا کرنے کے لیے بجلی موجود تھی۔ اور چونکہ یہ بجلی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لیے مکان ہی کرائے کے بغیر مل سکتا ہے' اس لیے اسے مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ وہ اگر بیاہی ہوتی تو اسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں۔ لیکن وہ بیاہی نہیں' محض ایک عورت تھی۔۔۔۔۔۔۔ اور جب عورت کو بجلی کے پیسے دینے پڑیں' گھر کا

کرایہ ادا کرنا پڑے اور جس کے پلے خدا بخش سا آدمی پڑ جائے جو فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہو گی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔

میری سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے۔ اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں کا ہوتا ہے۔ چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جانتا۔ قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلا موجود ہے۔ بدرو اور موری کو کون نہیں جانتا۔ ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں۔ ہم اگر اپنے مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں' اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدرووں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جو ہمارے بدن کا میل پیتی ہیں۔ اگر مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قحبہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں سے لوٹ کر انسان مندروں اور مسجدوں کا رخ کرتے ہیں۔ اگر ہم افیون' بھنگ' چرس اور شراب کے ٹھیکوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کوٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں ہر قسم کا نشہ استعمال کیا جاتا ہے؟

بھنگیوں سے چھوت چھات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی ہمارے گھر سے گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر باہر نکلے تو ہم اپنی ناک پر رومال ضرور رکھ لیں گے۔ ہمیں گھن بھی آئے گی مگر ہم بھنگیوں کے وجود سے تو منکر نہیں ہو سکتے۔ اس فضلے سے تو انکار نہیں کر سکتے جو ہر روز ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ قبض' پیچش' اسہال وغیرہ دور کرنے کے لیے دوائیں اسی لیے موجود ہیں کہ ہمارے جسم سے فاسد مادے کا اخراج ضروری ہے۔ گندگی کے نکاس کے لیے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ گندگی ہر روز جمع ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں انقلاب برپا ہو جائے اور اس کے افعال بدل جائیں تو ہم قبض' پیچش اور اسہال کی باتیں نہیں کریں گے یا اگر گندگی کے نکاس کے لیے کوئی میکانکی طریقے ایجاد ہو جائیں تو بھنگیوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

ہم اگر بھنگیوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ذکر آئے گا۔ اگر ہم ویشیاؤں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً ان کے پیشے کا ذکر آئے گا۔

ویشیا کے کوٹھے پر ہم نماز یا درود پڑھنے نہیں جاتے۔ وہاں ہم جس غرض سے جاتے ہیں' ظاہر وہاں ہم اس لیے جاتے ہیں کہ وہاں ہم جا سکتے ہیں۔ وہاں جا کر اپنی مطلوبہ جنس بے روک ٹوک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے' جب ہر عورت اپنی مرضی پر ویشیا بن سکتی ہے اور ایک لائسنس لے کر جسم فروشی شروع کر سکتی ہے' جب یہ تجارت قانوناً جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم کیوں بات چیت نہیں کر سکتے؟

اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیے۔ ویشیا کو مٹایئے' اس

کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔

ہم وکیلوں کے متعلق کھلے بندوں باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم نائیوں' دھوبیوں' کنجڑوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم چوروں' اچکوں' ٹھگوں اور راہزنوں کے قصے سنا سکتے ہیں۔ ہم جنوں اور پریوں کی داستانیں بیٹھ کے گھڑ سکتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آسمان کی طرف شیطان بڑھنے لگتا ہے تو فرشتے تارے توڑ توڑ کر اسے مارتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہے۔ ہم داستان امیر حمزہ اور قصہ طوطا مینا تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم لندھور پہلوان کے گرز کی تعریف کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور میناؤں کے قصے سنا سکتے ہیں' جو ہر زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کے توڑ کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم عمل ہمزاد اور کیمیا گری کے متعلق جو من میں آئے کہہ سکتے ہیں۔ ہم داڑھیوں' پاجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔ ہم روغن جوش' پلاؤ اور قورمہ بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سبز رنگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن سجیں گے۔ ہم ویشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے؟ اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے' ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے جو اس کے پاس جاتے ہیں؟

ہم ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کا باہمی معاشقہ کرا سکتے ہیں' ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخش کے مزار پر کرا سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں جو ان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں' ان دونوں کے جنازے ایک اس محلے سے اور ایک اس محلے سے نکلوا سکتے ہیں۔ پھر ان باتوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے آپس میں ملوا سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اوپر سے فرشتوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بارش بھی کرا سکتے ہیں۔ ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے؟ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا۔ کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔

ویشیا کا مکان خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا' اس کے متعلق باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔

یہ لاش گلی سڑی' بدبودار سہی' متعفن سہی' بھیانک سہی' گھناؤنی سہی' لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز واقارب نہیں۔ ہم کبھی کفن اٹھا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے ''کالی شلوار'' میں ایسی لاش کا منہ دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں' کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہوگا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔''

ذہین پڑھنے والوں کے لیے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں میں نے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دہلی کی میونسپلٹی نے دہلی کی ویشیاؤں کے لیے ایک خاص جگہ مقرر کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا کہ مال گودام ان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں' وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر ''کالی شلوار'' جیسے کئی افسانے لکھیں گے۔

اسی لاش کا ایک بار میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا۔ میں اپنے مشہور افسانے ''ہتک'' کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں۔

''دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی' میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔''

''دو روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے اس کی چست اور پھول بھری چولی کے

نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔"

"اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔"

"وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں' پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں' جو اس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث سیاہی مائل رنگت اختیار کر گیا تھا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔"

یہ سلطانہ کی ایک بہن سوگندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدا بخش کے بجائے ایک خارش زدہ کتا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا' مگر یہ خارش زدہ کتا سوگندھی کے بہت کام آیا۔ میں اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں۔

"کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت نے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کر پر کرتی تھی' ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پر چانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشیاؤں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری "سلطانہ" اور میری "سوگندھی" تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی نیا جوڑ اور آسن پیش نہیں کرتیں وہ امساک کا کوئی خاندانی نسخہ نہیں بتاتیں۔ وہ کوئی لچھے دار آپ بیتی ہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔

میرا زیر بحث افسانہ ''کالی شلوار'' اگر آپ غور سے پڑھیں تو ذیل کی باتیں آپ کے ذہن میں آئیں گی۔

ا۔ سلطانہ ایک معمولی ویشیا ہے۔ پہلے انبالہ میں پیشہ کرتی تھی۔ بعد میں اپنے دوست خدا بخش کے کہنے پر دہلی چلی آئی۔ یہاں اس کا کاروبار نہ چلا۔

۲۔ خدا بخش خدا پر ناجائز بھروسہ کرنے اور فقیروں کی کرامات پر ایمان لانے والا آدمی تھا۔

۳۔ سلطانہ کا جب کاروبار نہ چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئی۔ اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہو گیا' جب خدا بخش فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔

۴۔ محرم سر پر آ گیا' سلطانہ کی دوسری سہیلیوں نے کالے کپڑے بنوا لیے مگر وہ نہ بنوا سکی اس لیے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

۵۔ اس موقع پر شنکر آتا ہے۔ ایک آوارہ گرد۔ ذہانت' حاضر جوابی اور خوش گفتاری کے علاوہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سلطانہ کے پاس آتا ہے اور اپنی ان خوبیوں کے معاوضے میں اس سے وہ جنس طلب کرتا ہے جسے وہ دام لے کر فروخت کرتی ہے۔ سلطانہ یہ قبول نہیں کرتی۔

۶۔ دوسری مرتبہ شنکر خود نہیں آتا بلکہ اداس سلطانہ اسے خود بلاتی ہے اور اسے اپنے ٹھہرے پانی ایسی زندگی میں ایک حادثے کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس سے مل کر وہ خوش ہوتی ہے مگر یہ احساس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ محرم کے لیے اس کے پاس کالی شلوار کی کمی ہے۔ وہ شنکر سے کہتی ہے ''محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔''

۷۔ شنکر' محرم کی پہلی تاریخ کو ایک کالی شلوار سلطانہ کے لیے آتا ہے۔ خدا بخش کا خدا اور خدا رسیدہ بزرگوں پر غیر ضروری اعتقاد کام نہیں آتا' لیکن شنکر کی ذہانت کام آ جاتی ہے۔

یہ افسانہ پڑھ کر دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیا اس کا پلاٹ یا اس کا انداز بیان لوگوں کو ویشیاؤں کی طرف کھینچتا ہے؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا' ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ یہ اس مقصد کے لیے نہیں لکھا گیا۔ اگر اس کو پڑھ کر ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا تو افسانہ یہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں تو یہ افسانہ ایسا گیت نہیں جسے حظ اٹھانے کی خاطر لوگ گائیں اور بار بار گائیں۔ کوئی گراموفون کمپنی اس کے ریکارڈ نہیں بھرے گی' اس لیے کہ اس میں جذبات ابھارنے والے دادرے اور ٹھمریاں نہیں ہیں۔

''کالی شلوار'' جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے۔ان کو پڑھ کر شہوانی جذبات کی رال نہیں ٹپکنے لگتی۔اس کو لکھ کر میں کسی شرمناک فعل کا مرتکب نہیں ہوا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کا مصنف ہوں۔ میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی جس کے اشعار آپ کی خدمت میں نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا
کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

وہ ترا منہ سے منہ بھڑا جانا
وہ ترا جیب کا لڑا جانا

وہ ترا پیار سے لپٹ جانا
اور دل کھول کے چمٹ جانا

ہولے ہولے پکارنے لگنا
ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا

منہ سے کچھ پڑے بکے جانا
چھوٹ جانے کے گوں تکے جانا

تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ
نیند آئی ہے اب مجھے نہ جھنجھوڑ

وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس
وہ ترا ست ہو کے کہنا بس

بات باقی نہیں رہی اب تو
رات باقی نہیں رہی اب تو

کہیں تری یہ بات نبڑے گی
یا یونہی ساری رات نبڑے گی

مجھ میں باقی کچھ اب تو بات نہیں
صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں
دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی
یا کسو کو پکار بیٹھوں گی
آدمی کی جو ریخ نکلے گی
منہ سے کیوں کر نہ چیخ نکلے گی
کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا
دیکھیو کون ساتھ سووے گا!

(اقتباسات از مثنوی میر درد' مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

شکر ہے کہ میں اپنی پیاس اور بھوک خواہشات نفسانی کو پر چانے کے لیے ایسے اشعار نہیں لکھے۔

لب سے لب مرے ملائے رکھنا
بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا
مطلب کے سخن پر روٹھ جانا
وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے
ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ
جی چاہا کہ اس سے بھی زیادہ
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار
وا کرنے نہ دینا بند شلوار

وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا
وہ تکیے پر سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگانی آہ لاتیں
حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا
وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا
قابو سے تڑپ کے نکل جانا
وہ چیں بجبیں ہو کے کہنا
کن بے کیسوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو یہی شغل دن رات
اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس
کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس!

(کلیات مومن، مثنوی دوئم، مطبوعہ نولکشور لکھنو)

عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے متعلق اگر اس انداز میں کچھ کہا جائے تو میں اسے معیوب نہیں سمجھوں گا۔ اس لیے کہ یہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ تنہائی میں جب مرد اور عورت ایک بستر پر اس غرض سے لیٹتے ہیں تو اسی قسم کی حیوانی حرکات کرتے ہیں۔ لیکن وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوتیں جیسا کہ ان اشعار میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ان کی حیوانیت کو شاعری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔ یہ لکھنے والے کی شرارت ہے، جو یقیناً قابل گرفت ہے۔

اگر مرد عورت کے اس حیوانی فعل کا فلم بنا کر پردے پر پیش کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام سلیم الدماغ آدمی نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ لیکن جو اشعار میں نے اوپر نمونے کے طور پر پیش کئے ہیں، وہ اس حیوانی فعل کی ایک غلط تصویر پیش کرتے

ہیں۔

ایسی شاعری ''دماغی جلق'' ہے۔ لکھنے اور پڑھنے والوں' دونوں کے لیے۔ میں اسے مضر سمجھتا ہوں۔ میرے افسانے ''کالی شلوار'' میں ایسا کوئی عیب نہیں ہے۔ میں نے اس میں کہیں بھی مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو لذیذ انداز میں بیان نہیں کیا۔ میری سلطانہ سے جو اپنے گاہک گوروں کو اپنی زبان میں گالیاں دیا کرتی تھی اور ان کو الو کے پٹھے سمجھتی تھی' کسی قسم کی لذت یا کسی قسم کے حظ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ ایک دکاندار تھی' ٹھیٹ قسم کی دکاندار۔ اگر ہم شراب کی دکان پر شراب کی بوتل لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں گے کہ وہ عمر خیام بنا بیٹھا ہوگا یا اس کو حافظ کا سارا دیوان ازبر یاد ہوگا۔ شراب کے ٹھیکیدار شراب بیچتے ہیں' عمر خیام کی رباعیاں اور حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے۔

میری سلطانہ' عورت بعد میں ہے' ویشیا سب سے پہلے ہے کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔ شنکر اس سے پوچھتا ہے۔ ''تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی؟''

سلطانہ جواب دیتی ہے۔ ''جھک مارتی ہوں۔۔۔۔۔۔''

وہ یہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا ''ٹائپ کرتا ہوں'' میری سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ میں کیا فرق ہے۔۔۔۔۔۔ غور کیجئے!



سہائے

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہو گا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے۔ لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جا سکتے ہیں۔ مذہب' دین' ایمان' دھرم' یقین عقیدت۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں' روح میں ہوتا ہے۔ چھرے' چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟''

ممتاز اس روز بہت ہی پر جوش تھا۔ ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ وہ ایک غیر متعین عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا۔ پاکستان' جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا' غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا' چنانچہ اسی صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔''

ممتاز نے اس سے پوچھا۔ ''کیا کرو گے؟''

جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں سوچ رہا ہوں' بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔''

یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی۔ جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے۔ ''میں سوچ رہا ہوں' بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔'' غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔ ممتاز کو جو اس کا جگری دوست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا' لیکن عجیب

بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہو گیا تھا۔ خاص طور پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے:

صبح اٹھتے ہی اس نے پینا شروع کر دی۔ اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لیے جا رہا ہے۔ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابل بیان مسرت محسوس کر رہا ہے' لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات چھپانے کے لیے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روانگی کے متعلق بات کروں' اشارتاً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پیگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں۔ لانڈری سے کپڑے لانے تھے۔ یہ سب کام اس نے ہنستے کھیلتے کیے۔ لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا۔ ''یاد ہے برج' آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا' گوبند نے ہمیں ایک روپیہ ادھار دیا تھا۔''

راستے میں ممتاز خاموش رہا' مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا' ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر' لیکن وہ کچھ ایسی پر خلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہو گیا' لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔

ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں' حتیٰ کہ ٹیکسی اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی' ہزار ہار ریفیوجی جا رہے تھے۔ خوشحال بہت کم اور بدحال بہت زیادہ۔ بے پناہ ہجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں۔ جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کیبن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا۔ ادھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے' ممتاز دیر تک دیکھتا رہا پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ یہ محض فریب نظر ہے۔ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا' لیکن یہ فریب نظر کس قدر دلکش ہے۔ یہ ملاپ!

جنگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چٹکیاں لے رہی تھی۔ میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔

ممتاز نے جہاز کی بار سے برانڈی منگوائی کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا۔ ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریفیوجی دھڑا دھڑ جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے تھے۔

جنگل نے دفعتاً ایک ہی جرعے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا۔ ''مجھے معاف کر دینا ممتاز۔ میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا۔''

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جنگل سے سوال کیا۔ ''جب تم نے کہا تھا' میں سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔ کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔ نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔''

جنگل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے افسوس ہے۔''

''تم مجھے مار ڈالتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا۔'' ممتاز نے بڑے فلفسیانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو' ایک مسلمان کو' ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔ وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرامزدگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مار ڈالا ہے۔ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''ہو سکتا ہے' میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے' لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا' مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں۔ مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے' جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔ لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا۔ تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا۔ بتاؤ' تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟ اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔ میں تو یہ کہوں گا' مرنے والے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار۔۔۔۔۔۔ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔''

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت زیادہ جذباتی ہو گیا۔ لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب' دین' ایمان' یقین' دھرم' عقیدت۔۔۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے جو چھرے' چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔''

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بے چینی سے کہا۔نہیں' بالکل ٹھیک نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں' اچھی طرح ادا نہیں کر سکا۔ مذہب سے میری مراد یہ مذہب نہیں' یہ دھرم نہیں' جس میں ہم میں سے ننانوے فیصدی مبتلا ہیں۔ میری مراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت بخشتی ہے۔ وہ چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے۔ لیکن یہ چیز کیا ہے؟ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھا سکتا۔'' یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا۔ ''لیکن اس میں وہ کون سی خاص بات تھی؟۔۔۔۔۔۔۔کٹر ہندو تھا۔۔۔۔۔۔۔ پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟''

میں نے پوچھا۔ ''کس کی؟''

''ایک بھڑوے کی۔''

ہم تینوں چونک پڑے۔ ممتاز کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا' اس لیے میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ایک بھڑوے کی؟''

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرف عام میں ایک بھڑوا تھا۔ عورتوں کا دلال۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔

ممتاز تھوڑی دیر کے لیے رک گیا' جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے۔ چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ کچھ ''سہائے'' تھا۔ بنارس کا رہنے والا۔ بہت ہی صفائی پسند۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پردے کا معقول انتظام تھا۔ چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے لیکن گدیلے اور گاؤ تکیے موجود تھے۔ چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اجلے رہتے تھے۔ نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ صرف صفائی ہی نہیں' ہر کام۔ اور وہ سر سے بلا کبھی نہیں ٹالتا تھا۔ دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔ رات زیادہ گزر گئی اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجیے۔ اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپاتا نہیں تھا۔ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے کما چکا ہے۔ ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر۔ اسے صرف دس ہزار بنانے تھے۔ معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں' زیادہ کیوں نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور بزازی کی دکان کھولے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزومند کیوں تھا۔''

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا۔ ''عجیب وغریب آدمی تھا۔''

ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سرتاپا بناوٹ ہے۔ ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ کون یقین کرسکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جواس کے دھندے میں شریک تھیں' اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لیے بعیدازفہم تھا کہ اس نے ہرلڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹ کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ناقابل یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔ اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا' امینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں۔ میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جاکر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔ یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں۔ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرایا کہ مجھے بنا رہا ہے۔

ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی' لاہور سے خط لکھا کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی۔ اس اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جاکر بزازی کی دکان کھول سکے۔ یہ سن کر تو میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا' کیونکہ میں مسلمان ہوں' اس لیے مجھے خوش کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

میں نے ممتاز سے پوچھا۔ ''تمہارا خیال غلط تھا؟''

''بالکل' اس کے قول وفعل میں کوئی بعد نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو' بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں۔ مگر وہ ایک بہت عمدہ انسان تھا۔''

جگل نے سوال کیا۔ ''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''اس کی موت پر'' یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لیے خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے۔ ''فسادات شروع ہوچکے تھے' میں علی الصبح اٹھ کر بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ کرفیو کے باعث بازار میں آمدورفت بہت ہی کم تھی۔ ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے ٹوکرے کے پاس گٹھڑی سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پاٹی والا (مزدور) سو رہا ہے۔ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھڑے دیکھے تو رک گیا۔ واردات قتل کی تھی۔ میں

نے سوچا' اپنا راستہ لوں مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں پھر رک گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ مگر خون کے دھبوں سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا۔ اس کی ٹول کی سفید قمیص جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی۔ زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا۔ اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے۔ ایک دو بار میں نے اس کو نا مکمل نام سے بھی پکارا۔ میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا۔ ''آپ۔۔۔۔۔۔۔آپ؟''

میں نے اسے تلے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دیں۔ وہ کیسے ادھر آیا' کس نے اس کو زخمی کیا' کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ سامنے ہسپتال ہے' کیا میں وہاں اطلاع دوں؟''

اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ جب میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے۔ ''میرے دن پورے ہو چکے تھے۔ بھگوان کو یہی منظور تھا۔''

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا' لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر' مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے' اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کو مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا' وہ بھی مسلمان تھا۔ میں ڈرپوک تو نہیں' لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا' ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں' دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لیے دھر لیا جاؤں گا۔ ایک بار یہ خیال آیا' اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پتہ ہے' اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچے' مرنا تو ہی کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا بلکہ یوں کہیے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا۔ میں ٹھہر گیا۔ نہ ٹھہرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔ میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا' گویا اس سے کہہ رہا ہوں' جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے۔ اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اپنی قمیص کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا۔ مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا۔ ''نیچے بنڈی ہے۔۔۔۔۔۔ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں ۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔یہ سلطانہ کا مال ہے۔ میں نے۔۔۔۔۔۔میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔آج اسے ۔۔۔۔۔۔آج اسے بھیجنے والا تھا۔۔۔۔۔۔کیونکہ۔۔۔۔۔۔کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔۔۔۔آپ

اسے دے دیجئے گا۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔کہیے گا فوراً چلی جائے۔۔۔۔۔۔۔لیکن۔۔۔۔۔۔۔اپنا خیال رکھئے گا۔''

ممتاز خاموش ہو گیا' لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز سہائے کی آواز میں جو جے جے ہسپتال کے سامنے فٹ پاتھ پر ابھری تھی' دور ادھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے' حل ہو رہی ہے۔

جہاز نے وسل دیا تو ممتاز نے کہا۔ ''میں سلطانہ سے ملا۔ اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ ہل رہا تھا۔ میں جگل سے مخاطب ہوا۔ ''کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز سہائے کی روح کو بلا رہا ہے۔ ہم سفر بنانے کے لیے۔''

جگل نے صرف اتنا کہا۔ ''کاش' میں سہائے کی روح ہوتا۔''



ٹوٹو

میں سوچ رہا تھا۔

دنیا کی سب سے پہلی عورت جب ماں بنی تو کائنات کا رد عمل کیا تھا؟

دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تمتمائی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا۔ ''میں بھی خالق ہوں۔''

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بالکنی سے اٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلیفون ضدی بچے کی طرح چلائے جا رہا تھا۔

ٹیلیفون بڑی مفید چیز ہے' مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس لیے کہ یہ وقت بے وقت بجنے لگتا ہے۔ چنانچہ بہت ہی بددلی سے میں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر بتایا۔ ''فور فور فائیو سیون''

دوسرے سرے سے ہلو ہلو شروع ہوئی' میں جھنجھلا گیا۔ ''کون ہے؟''

جواب ملا۔ ''آیا''

میں نے آیاؤں کے طرز گفتگو میں پوچھا۔ ''کس کو مانگتا ہے؟''

''میم صاحب ہے؟''

''ہے۔۔۔۔۔۔ٹھیرو''

ٹیلیفون کا ریسیور ایک طرف رکھ کر میں نے اپنی بیوی کو غالباً اندر سو رہی تھی' آواز دی۔ ''میم صاحب۔۔۔۔۔۔۔میم صاحب''

آواز سن کر میری بیوی اٹھی اور جمائیاں لیتی ہوئی آئی۔ ''یہ کیا مذاق ہے' میم صاحب' میم صاحب''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''میم صاحب ٹھیک ہے۔ یاد ہے' تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بدلے بیگم صاحبہ کہا کرو تو اس نے بیگم صاحبہ کو بینگن صاحبہ بنا دیا تھا۔''

ایک مسکراتی ہوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''دریافت کرلو۔''

میری بیوی نے ٹیلیفون اٹھایا اور ہلو ہلو شروع کر دیا۔ میں باہر بالکنی میں چلا گیا۔ عورتیں ٹیلیفون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ تک ہلو ہلو ہوتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا۔

ٹیلیفون پر ہر دو تین الفاظ کے بعد ہلو کیوں کہا جاتا ہے؟

کیا اس ہلو ہلو کے عقب میں احساس کمتری تو نہیں؟ بار بار ہلو صرف اسے کرنی چاہیے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کی مہمل گفتگو سے تنگ آ کر سننے والا ٹیلیفون چھوڑ دے گا یا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔

دفعتاً میری بیوی گھبرائی ہوئی آئی۔ ''سعادت صاحب! اس دفعہ معاملہ بہت ہی سیریس معلوم ہوتا ہے۔''

''کون سا معاملہ؟''

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا۔ ''بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ہے۔ پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہو گی۔ بس پھسری کا بھگندر بنا ہو گا۔ دونوں سر پھرے ہیں۔''

''اجی حضرت کون؟''

''میں نے بتایا نہیں آپ کو؟ اوہ ـــــــ ٹیلیفون' طاہرہ کا تھا۔''

''طاہرہ ـــــــ کون طاہرہ؟''

''مسز یزدانی''

''اوہ!'' میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ''کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے؟''

نیا اور بہت بڑا ـــــــ جائیے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟''

''معلوم نہیں۔ طاہرہ سے ٹیلیفون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا۔ ''بھابی جان! ذرا منٹو صاحب کو بلائیے۔''

خواہ مخواہ میرا مغز چاٹے گا۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور ٹیلیفون پر یزدانی سے مخاطب ہوا۔

اس نے صرف اتنا کہا۔ ''معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے۔ تم اور بھابی جان ٹیکسی میں فوراً یہاں آ جاؤ۔''

میں اور میری بیوی جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے یزدانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں کیں۔

طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطا یزدانی ایک پٹھان آڑھتی کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی' پھر ڈرامہ نگاری' اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا۔ طاہرہ کا باپ اپنے آٹھویں عشق میں مشغول تھا اور عطا یزدانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لیے ''بیلچہ'' نامی ڈرامہ لکھنے میں ایک شام پریڈ کرتے ہوئے عطا یزدانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں' ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا۔ چند ماہ تک دونوں میں نامہ و پیام جاری رہا اور آخر کار دونوں کی شادی بغیر کسی حیل حجت ہو گئی۔ عطا یزدانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔

طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی۔ عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شاپنگ کو جاتی تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی۔ گنجے آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو جاتی۔ ''میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماؤں گی' چاہے تم کچھ ہی کرو۔'' ذہین تھی۔۔۔۔۔۔ایک دفعہ اس کے پاس کوئی پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کمر کے گرد ازار بند باندھا اور اس میں ساڑھی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔

کیا طاہرہ واقعی عطا یزدانی کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقیہ خط ملنے پر اس کا ردعمل غالباً یہ تھا کہ کھیل دلچسپ ہے کیا ہرج ہے' کھیل لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا ردعمل کچھ اسی قسم کا تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی' یعنی جہاں تک با عصمت ہونے کا تعلق ہے' لیکن تھی کھلنڈری۔ اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا' میں سمجھتا ہوں' ایک کھیل ہی تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ کھیل بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے۔ گلے شکوے' طعنے مہنے' پرانے مردوں پر نئی لاشیں' نئی لاشوں پر پرانے مردے۔۔۔۔۔۔جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پلک نکلنے لگی۔

طاہرہ کو شکایت تھی کہ عطا اسٹوڈیو کی ایک واہیات ایکٹرس کو ٹیکسیوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔

یزدانی کا بیان تھا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔

طاہرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ عطا کا اس ایکٹرس سے ناجائز تعلق ہے۔ جب وہ صاف انکاری ہوا تو طاہرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا۔ ''کتنے پارسا بنتے ہو۔ یہ آیا جو کھڑی ہے' کیا تم نے اسے چومنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو میں اوپر سے آ گئی ۔۔۔۔۔''

یزدانی گرجا۔ ''بکواس بند کرو۔''

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہو گیا۔

میں نے سمجھایا' میری بیوی نے سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عطا کو تو میں نے ڈانٹا بھی۔ ''زیادتی سراسر تمہاری ہے۔ معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو۔''

عطا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ''سعادت! یہ قصہ یوں ختم نہیں ہوگا۔ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے۔ لیکن میں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ عنایت کو جانتے ہو تم؟''

''عنایت؟''

''پلے بیک سنگر ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے باپ کا شاگرد؟''

''ہاں ہاں''

''اول درجے کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ مگر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلاتی ہے۔ بہانہ یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔''

طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بہانہ وہانہ کچھ نہیں۔ بولو' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

عطا نے نہایت انتہائی نفرت کے ساتھ کہا۔ ''کچھ نہیں۔''

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی۔ ''عنایت میرا چاہنے والا ہے۔ بس!''

عطا نے گالی دی۔ عنایت کو موٹی اور طاہرہ کو چھوٹی۔ پھر شور برپا ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کچھ دہرایا گیا جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا۔ میں نے اور میری بیوی نے بہت ثالثی کی مگر نتیجہ وہی صفر۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑکتے تھے اور کوئی مرئی نتیجہ پیدا کئے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے۔ لیکن ہوتا ہواتا کچھ نہیں تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور طاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک

بک اور جھک جھک جاری تھی۔ لیکن انجام خدا معلوم کہاں بھٹک رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے کہا۔ ''بھئی اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں نبھ سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔''

طاہرہ خاموش رہی' لیکن عطا نے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا۔ ''علیحدگی نہیں' طلاق''

طاہرہ چلائی۔ ''طلاق' طلاق' طلاق۔۔۔۔۔۔۔ دیتے کیوں نہیں طلاق۔ میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو۔''

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''دے دوں گا اور بہت جلد۔''

طاہر نے اپنے ماتھے پر سے بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی۔ ''آج ہی دو۔''

عطا اٹھ کر ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔ ''میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔''

جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے تو اٹھ کر عطا کو روکا۔ ''بیوقوف نہ بنو' بیٹھو آرام سے۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''نہیں بھائی جان' آپ مت روکئے۔''

میری بیوی نے طاہرہ کو ڈانٹا۔ ''بکواس بند کرو۔''

''یہ بکواس صرف طلاق ہی سے بند ہو گی۔'' یہ کہہ کر طاہرہ ٹانگ ہلانے لگی۔

''سن لیا تم نے؟'' عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر ٹیلیفون کی طرف بڑھا' لیکن میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

طاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی۔ مجھے طلاق دے کر اس چڑو ایکٹرس سے بیاہ رچائے گا۔''

عطا نے طاہرہ سے پوچھا۔ ''اور تو؟''

طاہرہ نے ماتھے پر بالوں کے پسینے میں بھیگی ہوئی جھالر ہاتھ سے اوپر کی۔ ''میں تمہارے اس یوسف ثانی عنایت خان سے۔''

''بس اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ حد ہو گئی ہے۔ تم ہٹ جاؤ ایک طرف۔''

عطا نے ڈائریکٹری اٹھائی اور نمبر دیکھنے لگا۔ جب وہ ٹیلیفون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا لیکن نمبر نہ ملا۔ مجھے موقعہ ملا تو میں نے اسے پرزور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ اس پر طاہرہ نے کہا۔ ''صفیہ! تم کچھ نہ کہو' اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے۔ میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے۔ اس وقت میں اس کے دل کا قرار' اس کی آنکھوں کا نور تھی۔ میری زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ میرے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھ کر یہ بخوشی مرنے کے

لیے تیار تھا۔لیکن آج اسے میری ذرہ برابر پرواہ نہیں۔''

عطا نے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔

طاہرہ بولتی رہی۔''میرے باپ کی موسیقی سے بھی اسے عشق تھا۔اس کو فخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے۔شادی کو منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے ان کے پاؤں تک دابے' پر آج اسے ان کا کوئی خیال نہیں۔''

عطا ڈائل گھماتا رہا۔

طاہرہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔''آپ کو یہ بھائی کہتا ہے' آپ کی عزت کرتا ہے۔کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ٹیلیفون کر رہا ہے قاضی کو' مجھے طلاق دینے کے لیے۔''

میں نے ٹیلیفون ایک طرف ہٹا دیا۔''عطا' اب چھوڑو بھی۔''

''نہیں'' یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

طاہرہ بولی۔''جانے دیجیے' بھائی جان!اس کے دل میں میرا کیا' ٹوٹو کا بھی کچھ خیال نہیں۔''

عطا تیزی سے پلٹا۔''نام نہ لو ٹوٹو کا۔''

طاہرہ نے نتھنے پھلا کر کہا۔''کیوں نام نہ لوں اس کا؟''

عطا نے ریسیور رکھ دیا۔''وہ میرا ہے۔''

طاہرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔''جب میں تمہاری نہیں ہوں تو وہ کیسے تمہارا ہو سکتا ہے۔تم تو اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔''

عطا نے کچھ دیر سوچا۔''میں سب بندوبست کر لوں گا۔''

طاہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھا گئی۔''ٹوٹو کو چھین لو گے مجھ سے؟''

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔''ہاں''

''ظالم''

طاہرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔بے ہوش کر گرنے ہی والی تھی کہ میری بیوی نے اسے تھام لیا۔عطا پریشان ہو گیا۔پانی کے چھینٹے' یوڈی کلون' سملنگ سالٹ' ڈاکٹروں کو ٹیلیفون۔۔۔۔۔۔۔اپنے بال نوچ ڈالے' قمیص پھاڑ ڈالی۔طاہرہ ہوش میں آئی تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگا۔''جانم ٹوٹو تمہارا ہے' ٹوٹو تمہارا ہے۔''

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔ ''نہیں وہ تمہارا ہے۔''

عطا نے طاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ ''میں تمہارا ہوں' تم میری ہو' ٹوٹو تمہارا بھی ہے میرا بھی ہے۔''

میں نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چل دیا۔ ٹیکسی کھڑی تھی' ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میری بیوی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ ٹوٹو کون ہے؟''

میری بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ان کا لڑکا''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''لڑکا؟''

میری بیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا۔ ''کب پیدا ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔''

''ابھی پیدا نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔۔ چوتھے مہینے میں ہے۔''

چوتھے مہینے میں' یعنی اس واقعے کے چار مہینے بعد' میں باہر بالکنی سے بالکل خالی الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے والا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کون تھا؟''

''یزدانی صاحب''

''کوئی نئی لڑائی تھی؟''

''نہیں...... طاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے' مری ہوئی۔'' یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں سوچنے لگا۔ اگر اب طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ٹوٹو چکائے گا۔

◆◆◆